

و هَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ

اور یہ ایک کتاب ہے جسکو ہم نے بھیجا ہے، خیر و برکت والی ہے

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

اردو ترجمانی

ظہور البکرا اعظمی

ناشر

دیوبند (یوپی)
بیت الحکمت

۲/۵۵

سینا بازار

اجی 5

ابن جریر، ابو حنیفہ شری

دوست راہز

۷۸۶

پارہ سیتول کا

ہذا کتاب انزلنا مبارک

تفسیر ابن جریر

اُردو

تالیف

امام ابو جعفر محمد ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ قرآن پاک

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ

اردو ترجمانی

ظہور الباقی اعظمی

شائع کرنا

”سید حکمت و پویا“

ضلع سہارنپور یو پی

(قیمت ڈوڑھے)

مکتبہ عثمانیہ 2280 مینا بازار

پیر الہی بخش کالونی کراچی 5

ایک نادر پیشکش

عقائد دیوبند اور اہل سنت والجماعت پر ایک معرکہ الآراء کتاب

اسلامی عقیدے

تالیف :- از حضرت علامہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی

اردو ترجمہ :- حضرت مولانا محمدناظر شاہ صاحب کاشمیری

ہمارا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟ خدا تعالیٰ کی صفات کیا ہیں؟ وہ اگر ایک ہے تو کیوں؟ وہ عالم کا پالنے والا کس لیے ہے؟ وہ کیوں ہے۔ وہ قدر کس طرح ہے؟ اس نے اس دنیا کو کیوں پیدا کیا؟ یہ دنیا کس طرح چل رہی ہے؟ نبوت کیا ہے؟ انبیاء کون ہیں؟ رسالت و نبوت کے بارہ میں اسلامی تصورات، مذہب اسلام کی حقانیت، تمام مذاہب کا مکمل بطلان، تمام غلط افکار و نظریات کی تردید۔ قیامت، صور اسرافیل، ملک الموت، موت اور اس کے مرحلے، عالم قبر، سوال و جواب، محشر، جنت و جہنم، پلصراط، حساب و کتاب، آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، خلافت راشدہ، شیعہ فرقہ کی تردید اور مذہب اہل حق کی وضاحت، تقیہ کی حقیقت، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل، سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت قائمہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عہد عدالت گستر، اور ایسے ہی ہزاروں عنوانات پر اسلامی عقیدوں کا دفتر نایاب، یہ کتاب اسلامی عقیدہ اور دیوبند کے مکتبہ فکر کی مکمل ترجمان ہے، اس کی گونا گوں خصوصیات ہی کی بنا پر حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری مرحوم فرماتے تھے کہ:-

”اسلامی عقیدہ کے سلسلہ میں ایسی نایاب و نادر کتاب میری نظر سے نہیں گزری“

یہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی مرحوم جو ہندوستان میں فن حدیث کے امام اور سرخیل ہیں کی ایک فارسی کتاب ”تکمیل الایمان“ کا مکمل اردو ترجمہ ہے، جا بجا، مترجم کے قلم سے نادر و نایاب حاشیے درج ہوئے ہیں، شروع میں علم عقائد و کلام پر ایک بسوڑا مقدمہ جس میں ”کلام“ کے تمام مکاتیب فکر کی تاریخ، اس علم کے مختلف مراحل اور موڑ سامنے آگئے۔ کتاب پڑھنے میں جاچکی ہے۔ جلی اور روشن کتابت، خوبصورت ٹائٹیل، وڈسٹ کور، ظاہری اور معنوی خوبصورتی کا حسین ترین مرقع۔ آرڈر جلد تک کر لیتے۔ ایک اڈیشن ختم ہو چکا، کہیں ایسا نہ ہو کہ انتظار کرنا پڑے۔ پاکستانی خریدار ڈاک خرچ و قیمت کا منی آرڈر حسب ذیل پتہ پر کر کے رسید ہم کو بھیجیں۔ قیمت غیر مجلد تین پچیس پیسے، مجلد تین روپے پچھتر پیسے۔ ہندوستانی پتہ یہ ہے:-

حضرت مولانا محمد صاحب النوری مکان ۲۲۳۳ مین بازار سنت پور کلاٹل پور (مغربی پاکستان)

نخضر راہ بک ڈپو دیوبند ضلع سہارنپور یوپی (انڈیا)

DATA ENTERED
نہرست مضامین ابن جریر طبری اردو سیکولر
۱۹۶۱ء
۱۲۳۳
۱۳۲۹۹

نمبر	عنوان	نمبر	نمبر	عنوان	نمبر
۶۷	دنیا کے دھوکے	۱۳	۵	حرمت والے مہینے، خرچ کرنے کا حکم	۱
۶۸	اختلاف کی بنیاد اور اس کا حل	۱۴	۱۰	حج کے چند احکام	۲
۷۳	امتحان تمہارا بھی ہوگا	۱۵	۳۳	احرام حج کے بعد	۳
۶۴	صدقہ کہاں خرچ کیا جائے؟	۱۶	۴۱	ہم خرما و ہم ثواب	۴
۷۶	جہاد کی فرضیت	۱۷	۴۱	حج کے چند بنیادی اعمال	۵
۷۷	فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے	۱۸		اللہ کے نام اور اس کی عظمت کے ذکر	۶
۸۱	اللہ کی رحمت، اپنے پاک بندوں پر	۱۹	۴۷	سے سماں پیدا کر دو	
۸۲	چند سوالات کے جوابات	۲۰	۵۰	ایام حج میں اللہ کا ذکر	۷
۸۴	خرچ کتنا کیا جائے؟	۲۱	۵۳	طبقہ منافقین کا تذکرہ	۸
۸۷	یتیموں کے متعلق	۲۲	۵۷	اور جو رضائے الہی کے طالب ہیں	۹
۸۹	مشرکوں سے نکاح کی ممانعت	۲۳	۵۹	ایمان لائے ہو تو پوری طرح اسے اپنالو	۱۰
۹۲	حیض کے متعلق سوال کا جواب	۲۴	۶۲	کیا قیامت کا انتظار ہے؟	۱۱
	تَحْرِيقُ الْفَهْرِسْتِ		۶۵	انعامات الہی کی بے قدری کرنے والوں کی سزا	۱۲

دو نادر تحقیقات

انرا مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ
ہوئی جہاز، ریڈیو، واٹر ٹیس، تار، ٹیلیفون سے ملنے والی اطلاعات پر شرعی نقطہ نظر سے
مفصل بحث۔ کیا عیدین اور رمضان المبارک کے چاند کے سلسلے میں مذکورہ بالا ذرا تاح سے
ملنے والی خبروں پر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے؟ پوری وضاحت سے شرعی نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے، سائنسی اور
تاریخی مواد کی روشنی میں!۔
نوٹو گرافی کی شرعی حیثیت، فوٹو اور آئینہ کے عکس کا فرق، تفصیل کے ساتھ دلائل کی
نوٹو گرافی کے شرعی مسائل روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

اہل رائے کی نظر میں

تفسیر ابن جریر طبری اردو۔ بیت الحکمت دیوبند

(۱) مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کا تبصرہ "صدق جدید" میں

”انام ابن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان کا پایہ عربی تفسیروں میں کیا بہ لحاظ قدامت و استناد، اور کیا بہ لحاظ جامعیت مباحث یقیناً بلند و معروف ہے۔ وہ کسی صراحت و بیان کا محتاج نہیں۔ علوم قرآنی سے شد بڑ رکھنے والا بھی اس کے مرتبہ علمی سے واقف ہے۔ اردو دانوں کی خوش قسمتی ہے کہ تفسیر موصوف اب اردو میں منتقل ہو کر آ رہی ہے۔ اور پارہ اول تین حصوں میں منقسم ہو کر اس وقت تک منتقل ہو چکا ہے۔ یہ تفسیر بے بدل اردو دانوں کے حق میں ایک نعمت، غیر مترقبہ ہے۔ مترجم نے یہ بھی اچھا کیا ہے کہ زیادہ دقیق لغوی بحثیں ترجمہ میں نظر انداز کر دی ہیں“

(ہفتہ وار صدق جدید) لکھنؤ، ارشوال المکرّم ۱۳۸۵ھ

(۲) مولانا سعید احمد اکبر آبادی، صدر شعبہ دینیات مسلولیونیورسٹی علی گڑھ
کا تبصرہ ”برہان“ میں

”تفسیر ابن جریر طبری قدیم تفسیر ہے اور اپنی بعض علمی و تحقیقی خصوصیات کے لحاظ سے بعض مشہور و متداول کتب تفسیر سے فائق ہے، زیر تبصرہ کتاب جس کے اب تک تین حصے شائع ہو چکے ہیں، اس کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ ہے، کہیں مختصر تشریحی حواشی بھی لائق مترجم کے قلم سے ہیں۔ اس تفسیر کے مضامین پر عاوی ہو جانے سے ایک غیر عالم بھی اچھا خاصہ عالم بن سکتا ہے۔“

(ماہنامہ ”برہان“ دہلی۔ ریح الثانی ۱۳۸۴ھ)

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرْمَتُ قِصَاصٌ فَمَنْ اعْتَدَى

حرمت والاہدینہ سے بعوض حرمت والے مہینے کے اور یہ ہر مہینے میں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں سو جو تم پر زیادتی

عَلَيْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ

کے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اُس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۹۲﴾ وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا

اور یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور

بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۳﴾

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو اور کام اچھی طرح کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو

”الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرْمَتُ قِصَاصٌ“ سے مراد ذی قعدہ ہے، اسی مہینے میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ حدیبیہ کا احرام باندھا تھا اور مکہ کے مشرکین نے آپ کو بیت اللہ تک پہنچنے

سے روکا تھا یہ واقعہ ۶۰۰ھ میں پیش آیا تھا۔ لیکن اُن حضورؐ نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ آئندہ سال آپ

تشریف لاکر عمرہ کریں گے اور مکہ معظمہ میں تین دن قیام کریں گے۔ چنانچہ اُن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ

اگلے سال ۶۰۱ھ میں، اسی ذی قعدہ کے مہینے میں جس میں مشرکین نے آپ کو روکا تھا، مکہ معظمہ تشریف لائے۔

مکہ والوں نے آپ کے لیے شہر خالی کر دیا۔ اُن حضورؐ نے وہاں تین دن قیام کیا اور عمرہ پورا کیا۔ اس کے بعد

آپ مدینہ کے لیے وہاں سے نکل پڑے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ اور مسلمانوں سے ارشاد

فرمایا کہ ”حرمت والاہدینہ“ جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں مشرکین کے علی الرغم مکہ معظمہ تک پہنچایا اور تمہیں عمرہ ادا کرنے

کا موقعہ دیا اس ”حرمت والے مہینے کے بدلے میں ہے“ جس میں گذشتہ سال تمہیں مشرکین قریش نے مکہ میں

داخل ہونے سے روکا تھا، اور تم ناگواری کے ساتھ واپس آگئے تھے اور بیت اللہ تک پہنچنا تمہارے لیے ممکن

نہ ہو سکا تھا۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسی کا بدلہ دیا ہے کہ مشرکین نے تمہیں جس مہینے میں گذشتہ سال

تمہاری ناگواری کے باوجود واپس کر دیا تھا، اسی مہینے میں اب مشرکین کی ناگواری کے باوجود تمہیں بیت اللہ پہنچا

رہا ہے۔ آیت کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ، سعدی، عیاض، ابن زید اور عطاء رحمہم اللہ

سے نقل ہے۔ قتادہ کی روایت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کا احرام باندھ کر ذی قعدہ کے مہینے میں آئے،

آپ کے ساتھ ہدی بھی تھی۔ جب آپ مقام حدیبیہ پر پہنچے تو مشرکین قریش نے آپ کو مکہ میں داخلہ سے روکا

پھر اُن حضورؐ نے ان سے اس شرط پر صلح کی کہ اس سال تو آپ واپس چلے جائیں گے، لیکن آئندہ سال

تشریف لائیں گے اور مکہ معظمہ میں تین دن تک قیام کریں گے۔ مکہ میں اپنے ساتھ سواروں کے ہتھیار کے سوا

اور کوئی ہتھیار نہ لائیں گے۔ مکہ سے واپس ہوتے ہوئے وہاں کے کسی بھی فرد کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے

چنانچہ مسلمانوں نے اپنی قربانی کے جانور حدیبیہ میں ہی ذبح کر دیئے اور وہیں سرمنڈالیا یا قصر کر لیا۔ پھر شرط کے مطابق اگلے سال آں حضورؐ اور آپ کے صحابہ مکہ میں داخل ہوئے اور ذی قعدہ ہی کے مہینے میں عمرہ کیا اور تین دن تک وہاں قیام کیا۔ مشرکین نے ایک سال پہلے آں حضورؐ کو واپس کر کے بڑا فخر کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دوسرے سال اس کا بدلہ دے دیا اور اسی مہینے میں انھیں مکہ معظمہ پہنچا یا جس میں قریش نے انھیں واپس کیا تھا اسی کے متعلق مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ ”وَاحْرَمَاتُ قِصَاصًا“ اور حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں، کا یہی مطلب ہے۔ سدی کی روایت میں ہے کہ صلح کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے سال مکہ میں خیبر کی فتح کے بعد مکہ معظمہ عمرہ کی قضا کے لئے تشریف لائے تھے۔ مشرکین نے مسلمانوں کے لئے تین دن کے لئے مکہ خالی کر دیا۔ آں حضورؐ نے اسی عمرہ کے موقع پر میونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ذی قعدہ کو ”الشہر الحرام“ (حرمت والا مہینہ) اس لئے فرمایا کہ عرب جاہلیت میں اس مہینے میں بھی جنگ اور قتل کو حرام سمجھتے تھے، ہتھیار رکھتے تھے اور اس میں کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا تھا، اگر کوئی شخص اس مہینے میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی پالتا تو اس سے کوئی تعارض نہیں کرتا تھا۔ اس مہینے کا نام ذوالقعدہ دقعد بمعنی بیٹھنے سے) اس لئے رکھا تھا کہ اس میں وہ جدال و قتال سے بچتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کا یہ نام باقی رہنے دیا۔ ”حُرْمَاتُ“ حُرْمَةُ کی جمع ہے اللہ تعالیٰ نے ”وَاحْرَمَاتُ قِصَاصًا“ (اور حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں) میں جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا کہ اس سے مراد حرمت والا مہینہ، حرمت والا شہر اور احرام کی حرمت سب ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے فرماتے ہیں کہ حرم میں احرام باندھ کر حرمت والے مہینے میں تمہارا داخل ہونا اس کا بدلہ ہے کہ تمہیں اسی حالت میں اس سے ایک سال پہلے حرم میں داخلہ سے روکا گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم قصاص کا مفہوم بیان کر چکے ہیں کہ عملی، قولی یا جسمانی کسی حیثیت سے بدلہ کے معنی میں ہے۔ آیت میں مراد عمل کا بدلہ ہے۔

”فَمَنْ اَعْتَدَىٰ عَلَيْنَا فَاَعْتَدُوا عَلَيْنَا بِمِثْلِ مَا اَعْتَدَىٰ عَلَيْنَا“ (پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے)۔ آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔ مسلمانوں کی تعداد ان دنوں بہت کم تھی۔ انھیں کسی طرح کا غلبہ بھی حاصل نہیں تھا کہ مشرکین ان سے ڈرتے، اس لئے انھیں ہر وقت مشرکین کے آواز سے، ان کی گالیاں اور دشنام طرازیوں سہنی پڑتی تھیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اگر کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ کسی مشرک کی دشنام طرازی کا جواب دے سکے تو اسے جواباً ویسا ہی اقدام کرنا چاہیے جیسا کہ مشرک نے کیا ہے، یا پھر صبر کرنا چاہیے اور معاف کر دینا چاہیے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عزت اور حکومت دی تو مسلمانوں کو حکم ہوا کہ آپس کے معاملات اور جھگڑوں میں اپنے امیر و حاکم کی طرف رجوع کریں اور ان کے فیصلے کے مطابق عمل کریں، جاہلیت کی طرح ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! مشرکین کے جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی ان سے جنگ کرو، جیسا کہ وہ تم سے جنگ کرتے ہیں، ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ میں عمرہ قضا کے بعد نازل ہوئی ہے۔ یہ قول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

میرے نزدیک مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول قابل ترجیح ہے۔ آیت کی ترتیب اور اس کے الفاظ سے صاف یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ جنگ کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ مشرکین تمہارے ساتھ جیسا معاملہ کریں تم بھی ان کے ساتھ وہی معاملہ کرو، ہاں اس میں حد سے آگے نہ بڑھو۔ زیر تفسیر آیت جب ایسی آیات کے ساتھ ذکر ہو رہی ہے جن کا تعلق جنگ اور جہاد سے ہے، اور یہ معلوم ہے کہ جہاد مسلمانوں پر مدینہ کی ہجرت کے بعد فرض ہوا ہے، تو یہ آیت بھی مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہوگی، مکہ میں اسکے نازل ہونے کا کوئی بھی واضح ثبوت نہیں ہے۔ اس آیت سے بھی بالکل اسی طرح کا مفہوم نکلتا ہے جیسا اس سے پہلے کی آیت سے نکلتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کوئی بھی تم پر حملہ آور ہو یا کوئی ظالمانہ اقدام کرے تو تم اس کا جواب اسی شدت کے ساتھ دو، تاکہ اس طرح اپنے دشمن سے اس کے ظالمانہ اقدام کا بدلہ لے سکو، تمہارا یہ اقدام ظلم نہیں کہلائے گا۔

”وَ اتَّقُوا اللَّهَ وَاَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ“ یعنی اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود اور حرمتوں کے بارے میں اس سے ڈرتے رہو، اس سے سر مو تجاوز نہ کرو، اور جان لو کہ اللہ انہیں کو پسند کرتا ہے جو اس کے فرائض کی ادائیگی اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے دور رہ کر تقویٰ کی زندگی اختیار کرتے ہیں۔

”وَ اَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ آیت کی تفسیر میں مفسرین سے کئی اقوال نقل ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ”وَ اَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو، میں ”اللہ کے راستے“ سے مراد مشرکین و کفار سے جہاد کا راستہ ہے، یعنی ان سے جہاد اور جنگ کے لئے مال بھی خرچ کرو (جان کی قربانی تو دیتے ہی ہو)۔ ”وَ لَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ اور اپنی آپ کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالو) سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے اس راستے میں خرچ سے ہاتھ نہ پھیچو اللہ تعالیٰ تمہیں اس خرچ کا بدلہ دے گا، اور اس دنیا میں بھی تمہارا یہ انفاق تمہاری ریزی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”لَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ سے مراد اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرنا ہے (کہ یہ ہلاکت و تباہی کا باعث ہوگا)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ جنگ میں قتل ہو جانا باعث ہلاکت نہیں ہے، بلکہ اللہ کے راستے میں جنگ کے لئے خرچ نہ کرنا باعث ہلاکت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارے پاس تھوڑا سا سامان ہے تو اسے بھی اللہ کے راستے میں دے ڈالو۔ عکرمہ، محمد بن کعب قرظی، مجاہد حسن، قتادہ، سدی، عطار اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی یہی تفسیر روایت ہے کہ جہاد میں اپنا مال بھی خرچ کرو اور اس خرچ کو روک کر اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو۔

آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور خود ہی اپنی جانوں کو تباہی میں نہ ڈالو، یعنی بغیر تیاری اور کھانے پینے کے سامان کے نہ نکلو، کہ یہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کرنے کے مرادف ہے“

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ”خود کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالو، کہ جو گناہ تم سے سرزد ہو چکے ہیں ان کی توبہ کے بارے میں مایوس ہو جاؤ، بلکہ اللہ کی رحمت سے امید رکھو اور عمل کیے جاؤ“ یہ تفسیر بزار بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا، اگر میں تنہا مشرکین پر حملہ کروں تو وہ مجھے قتل کر دیں تو کیا یہ بھی اپنے آپ کو تباہی میں ڈالتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، آیت کا تعلق خرچ کرنے سے ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا اور ان سے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جنگ کیجئے، آپ پر صرف آپ ہی کی تنہا ذمہ داری ہے، دوسروں کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ سے کسی نے پوچھا، کیا اس آیت میں ایسے شخص کا ذکر ہے جو آگے بڑھ کر جنگ کرتا ہے اور شہید کر دیا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ آیت کا تعلق ایسے شخص سے ہے جو گناہ کرتا ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر توبہ نہیں کرتا اور اس طرح اپنی جان کو خود تباہی میں ڈالتا ہے، عبیدہ سلمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں آپ سے نقل ہے کہ ”اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو“ سے مراد ”مایوسی“ ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ ”اللہ کے راستے میں جہاد کرنا نہ چھوڑو کہ یہ خود اپنے آپ کو تباہی میں ڈالتا ہے“ اسلم بن عمران سے روایت ہے کہ ہم نے قسطنطنیہ کی جنگ لڑی، مسلمانوں کی فوج کے مصری دستے کے عقیبہ بن عامر رضی اللہ عنہ امیر تھے اور دوسرے دستے کے امیر عبدالرحمن بن خالد بن ولید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ بیان کیا کہ ہم نے اپنی فوج کی دو صفیں بنائیں، میں نے ان دو صفوں سے زیادہ لمبی اور چوڑی صف کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رومی شہر پناہ کی دیوار سے بالکل لگے ہوئے کھڑے تھے۔ ہماری فوج کے ایک سپاہی نے نکل کر دشمن پر حملہ کرنا چاہا تو لوگوں نے کہا کہ ٹھہر جاؤ، اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اپنی جان کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی میں ڈالتے ہو۔ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اس پر فرمایا کہ قرآن کی جس آیت کی روشنی میں تم لوگ منع کر رہے ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مدد کی اور اسلام کو غالب کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں لائے بغیر ہم انصار نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب تک ہم لوگ اپنے گھر بار اور مال جانتا دو کھچھوڑے ہوئے تھے اور اس کے سدھار کی ہم نے کوئی فکر ہی نہیں کی، کیا اب، جب کہ اللہ نے اپنے نبی کی مدد کی اور اسلام کو غالب کر دیا ہے ہمیں اپنے گھر ٹھہر کر اپنے مال جانتا دو کی فکر اور اس کی اصلاح و سدھار کرنی چاہیے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ ”اللہ کے راستے میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو خود ہی تباہی میں نہ ڈالو“ تو خود ہی اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جہاد چھوڑ کر اپنے گھر بیٹھ رہیں اور اپنے مال و اولاد کی فکر میں لگ جائیں۔ ابو عمران نے بیان کیا کہ پھر ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ مسلسل اللہ کے راستے میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں آپ مدفون ہوئے۔ اسلم بن عمران ہی کی ایک دوسری روایت میں جو محمد بن عمارہ اسدی سے روایت ہے یہ ہے کہ مصریوں کے امیر عقیبہ بن عامر جنہی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور اہل شام کے امیر فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔

میرے نزدیک آیت کی بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اللہ نے اپنے راستے کی خود وضاحت کر دی ہے، مطلب یہ ہے کہ میرے دین کی سر بلندی کے لیے خرچ کرو، جو میں نے تمہارے لیے تمہارے اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مشروع کیا ہے۔ پھر مسلمانوں کو اس سے روکا کہ خود اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالیں، ارشاد ہوا کہ: اور خود اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو، یہ ایک محاورہ ہے، اہل عرب سپردگی کے لیے بولتے تھے "أَعْطَى فُلَانٌ بَيْدَهُ" فلاں نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا، ہتھیار ڈال دیا۔ اس محاورہ کی روشنی میں "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو تباہی کے سپرد مت کرو۔ اور اللہ کے راستے میں، جب خرچ کرنا ضروری ہو تو اسے چھوڑنے والا اور اس سے غفلت برتنے والا انسان اپنے آپ کو تباہی و بربادی ہی کے سپرد کرتا ہے، اللہ نے فرض صدقہ (زکات) کے خرچ کے لیے جو آٹھ مصرف بتائے ہیں ان میں ایک "اللہ کے راستے میں" خرچ کرنا بھی ہے "وَوَفِي سَبِيلِ اللَّهِ" اس لیے اس فرض کے چھوڑنے والے کے متعلق کسے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو تباہی کے سپرد نہیں کر رہے۔ اسی طرح اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے اور وہ اس کی توبہ کے بارے میں اللہ کی رحمت سے مایوس ہے تو یقیناً وہ بھی اپنے آپ کو تباہی کے سپرد کرتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے کہ "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، کہ اللہ کی رحمت سے کافر قوموں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا" یہی حال اللہ کے راستے میں جہاد کا بھی ہے، جب جہاد مسلمانوں کے لیے ضروری ہو اور ان کی مصلحت کا تقاضا ہو اور کوئی قدرت رکھتے ہوئے اس میں شرکت نہ کرے، تو وہ خود کو تباہی کے سپرد کرتا ہے۔ پس جب آیت "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" میں مذکورہ تمام ہی اقوال کی گنجائش ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آیت میں ان میں سے کسی خاص مفہوم کی تخصیص بھی نہیں کی ہے تو آیت کا ایک عام مفہوم ہی مراد لینا صحیح ہوگا، اور تفسیر ہم اس طرح کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنے سے منع کیا ہے اور ہر اس چیز سے روکا ہے جو ہماری بربادی و تباہی کا موجب ہو۔ یہ ایک عذاب ہے جو ہم پر اللہ تعالیٰ کے فرائض کو چھوڑنے کی صورت میں ہوگا، اور ہمارے لیے کسی وجہ میں بھی یہ جائز نہیں کہ وہ عمل کریں جو اللہ کے عذاب کا موجب ہو۔ آیت کے اس عام مفہوم کی روشنی میں تفسیر یہ ہوگی کہ "مسلمانوں، اللہ کے راستے میں خرچ کرو، اور اللہ کے راستے میں خرچ کو نہ چھوڑو کہ یہ تمہاری تباہی کا موجب ہے، کیونکہ اس بد عملی کے نتیجے میں تم میرے عذاب کے مستحق ٹھہرو گے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آیت میں "تہلکة" سے مراد اللہ کا عذاب ہے۔ گویا آیت میں پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا، پھر تنبیہ کی گئی کہ یہ خرچ تم پر فرض ہے اور اس کا چھوڑنا آخرت کے عذاب کا باعث ہے۔

"وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" یعنی اے مسلمانو! جو کچھ میں نے تمہارے لیے ضروری قرار دیا ہے ان کی ادائیگی اچھی طرح کرو، میرے فرائض کی بجا آوری، محرمات سے اجتناب، میرے راستے میں انفاق اور جو لوگ تم میں باحیثیت ہیں وہ کمزوروں کی پرستش احوال دل سے اور خوب اچھی طرح کریں، کیونکہ

میں اخلاص اور لگاؤ کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہوں۔ ابو اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”أَحْسِنُوا“ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اچھا گمان رکھو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تفسیر نقل ہوئی ہے کہ محتاجوں کی خبر گیری اچھی طرح کرو۔

وَأْتُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ

اور (جب حج و عمرہ کرنا ہو تو اس حج و عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو پھر اگر کسی دشمن یا مرض کے سبب روک دینے جاؤ تو قربانی

مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَخْلِقُوا رءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ

کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرو)۔ اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (ادوہ موقع

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهٖ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهِ فَغَدِيَةٌ

حرم ہے کہ کسی کے ہاتھ وہاں جانور بھیجا جاوے) البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو جس سے پہلے ہی سر منڈوانے کی ضرورت پڑ جائے تو

مِّنْ صِيَاهٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ

ادوہ سر منڈوا کر (غدیہ یعنی اس کا شرعی) دیدے (تین روزے سے یا چھ مسکین کو خیرات دیدیا) ایک بکری (ذبح کر دینے سے) پھر جب امن کی حالت میں

تَمَتُّعٍ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ

ذیا تو پہلے ہی سے کوئی خوف پیش نہ آیا ہو یا ہو کر جاتا رہا ہو تو جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر نفع ہوا ہو یعنی ایام حج میں عمر بھی کر لیا ہو تو جو کچھ قربانی میسر ہو

لَمْ يَجِدْ فَصِيَاهُ ثَلَاثَةٌ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٌ إِذَا رَجَعَهُمْ

(ذبح کرے) اور جس نے صرف عمرہ یا حج کیا ہو اس حج وغیرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر ہو تو اس کے ذمہ تین دن کے روزے ہیں (ایام)

تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاضِرِي

حج میں اور سات ہیں جبکہ حج سے تہائے لوٹنے کا وقت آجاوے یہ پورے دن کے لیے ہے جس کے اہل (وجہاں) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے

السَّجْدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ

قربان میں نہ لیتے ہوں (یعنی قریب ہی کا وطن دار نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں خلاف ہو جائے اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تم رہبانوں اور

صدا مخالفت کرنے والوں کو سزائے سخت دیتے ہیں :

”وَأْتُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ“ مفسرین کے اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ”حج کو اس کے مناسب اور اس کی سنتوں کے ساتھ پورا

حج کے چند احکام

کرو، اور عمرہ کو بھی اس کے حدود اور اس کی سنتوں کے ساتھ پورا کرو، اس مفہوم کے لیے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے ”وَ اتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِآلِ الْبَيْتِ“ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول اس روایت کا ذکر سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے کیا تو انہوں نے کہا کہ اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا تھا۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی قرأت ”وَ اتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِآلِ الْبَيْتِ“ نقل ہوئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بواسطہ علی بن ابی طلحہ ایک روایت میں ”وَ اتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ“ ہی ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے حج کا احرام باندھا تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ قربانی کے دن حج کے پورے ہونے سے پہلے حلال ہو جائے، جب حجرہ خقبہ کی رمی کر لے اور طواف زیارت سے فارغ ہو جائے پھر حلال ہوگا اسی طرح عمرہ پورا اس وقت ہوگا جب بیت اللہ کا طواف اور صفا اور مروہ کی سعی کر لے گا، پھر عمرہ کے احرام سے حلال ہوگا۔ مجاہد غلقمہ، ابراہیم اور ربیع رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی مضمون کی روایتیں نقل ہوئی ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”حج اور عمرہ کا پورا کرنا“ یہ ہے کہ حج اور عمرہ کے لیے الگ الگ مستقل سفر کرے اور اپنے گھر سے احرام باندھ کر جائے، اس کی روایت علی رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر اور طاؤس رحمہما اللہ سے ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ”عمرہ کا پورا کرنا“ یہ ہے کہ حج کے مہینوں کے سوا کسی اور مہینے میں اس کے لیے مستقل احرام باندھے اور ”حج کا پورا کرنا“ یہ ہے کہ حج کے تمام مناسک اس خوبی کے ساتھ ادا کیے جائیں کہ عامل پر قرآن یا تمتع کی وجہ سے..... کوئی قربانی نہ ضروری ہو۔ اس کی روایت قتادہ اور قائم بن محمد رحمہما اللہ سے ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ ”دونوں کے پورا کرنے“ کا مفہوم یہ ہے کہ گھر سے انھیں کے ارادے سے نکلے، کوئی بھی دوسرا مقصد اس سفر کا نہ ہو، سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”حج اور عمرہ کو پورا کرنے“ کا مفہوم یہ ہے کہ گھر سے صرف حج اور عمرہ کے ارادے سے نکلے، پھر بیقات پر پہنچ کر احرام باندھے، سفر کا مقصد کوئی تجارت یا کوئی اور ضرورت نہ ہو، کہ مکہ معظمہ کے قریب پہنچ کر سوچنے لگے کہ اگر حج بھی کر لیا جائے تو کیا حرج ہے!۔ اس طرح کا حج اگرچہ ادا تو ہو جاتا ہے لیکن حج کامل اسی وقت ہوتا ہے جب گھر سے سفر ہی اس مقصد سے کرے کوئی اور مقصد نہ ہو۔

پانچواں قول یہ ہے کہ ”حج اور عمرہ پورا کرو، یعنی جب شروع کر دو تو پورا کرو“ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عمرہ کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس پر مذکورہ بالا آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا کہ کسی کے لیے مناسب نہیں کہ کوئی کام شروع کر کے لے ادا ہو اور اچھوڑ دے، اس لیے جب احرام باندھ لیا تو بغیر ادائیگی کے واپس لوٹ آنا بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی روزہ رکھتا ہے تو اس کے لیے بھی جائز نہیں کہ آدھے دن روزہ رکھ کر لے سے توڑ دے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عمرہ نفل ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ حج کو پورا کرو اور عمرہ اللہ کے لیے ہے۔ یہ مفہوم اس صورت میں لیا جاسکتا ہے جب ”العمرة“ کا عطف ”الحج“ پر نہ ہو، بلکہ ”العمرة“ پر رفع پڑھا جائے۔ آیت کی ایک قرأت یہ بھی ہے۔ ابو بردہ اور شعبی رحمہما اللہ کا اس مسئلہ پر مذاکرہ ہوا تھا، ابو بردہ کا خیال تھا کہ عمرہ واجب ہے اور شعبی نے فرمایا کہ نفل ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول تو یہی ہے، لیکن آپ سے اس کا فرض ہونا بھی نقل ہے۔ بغیرہ رحمۃ اللہ علیہ آپ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔ اس کا فرض ہونا مسروق، علی بن

حسین، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی نقل ہے۔ آپ حضرات دلیل میں ہی آیت رکھتے ہیں کہ ”اور پورا کرو حج کو اور عمرہ کو“ مسروق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں ہیں چار چیزوں کا حکم دیا گیا ہے، نماز قائم کرنے کا، زکات دینے کا اور حج اور عمرہ کی ادائیگی کا۔ پھر آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت کی۔ اس قول کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ”حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، اس لیے کہ یہ دونوں فرض ہیں، اللہ کی طرف سے ان کو قائم کرنے کا اسی طرح حکم ہے جس طرح نماز قائم کرنے کا حج کی طرح عمرہ کی بھی فرضیت کے قائل صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے اہل علم کی ایک بڑی جماعت ہے۔ ہم نے ان کی اور ان سے منقول روایات کی تفصیل اس موقع پر مناسب نہیں سمجھی۔ ان حضرات کے نزدیک ”وَآتُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ“ کا مطلب ہے ”اور حج اور عمرہ کو قائم کرو“ علی، عبداللہ رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ معنی نقل ہوئے ہیں۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل ہے کہ آپ نے فرمایا، اگر دشواری اور حرج نہ ہوتا، اور یہ وجہ بھی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی حدیث نہیں سنی۔ تو میں کہہ دیتا کہ عمرہ بھی اسی طرح فرض ہے جیسے حج، ان کی ادائیگی ان کے حدود اور فرائض کے ساتھ کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے عمرہ کے متعلق نقل ہے کہ یہ نفل ہے، حج کی طرح فرض نہیں۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عمرہ واجب نہیں ہے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عمرہ سنت حسنة ہے۔ عبداللہ بن عون بھی شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی قول نقل کرتے ہیں۔ میرے نزدیک آیت کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ ”العمرۃ“ کا عطف ”الحج“ پر ہو اور دونوں کو نصب پڑھا جائے، یعنی آیت میں دونوں کو پورا کرنے کا حکم ہے، کیونکہ ”نصب“ کی قرارت پر تمام معتدروایتوں کا اتفاق ہے، خود اسی سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جنہوں نے ”العمرۃ“ پر نصب کے بجائے رفع پڑھا ہے۔ ”العمرۃ“ پر جو حضرات نصب پڑھتے ہیں ان میں بعض حضرات عمرہ کو واجب اور بعض نفل کہتے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہے کہ عمرہ نفل و سنت ہے، اور میری رائے بھی یہی ہے۔ اصل میں آیت سے دونوں ہی مفہوم مراد لیے جاسکتے ہیں، اسے نفل بھی کہا جاسکتا ہے اور واجب بھی۔ اگرچہ بعض روایات سے اس کے وجوب کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، مثلاً ابو المنفق رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میدان عرفہ میں حاضر ہوا، میں آپ کے اتنا قریب ہو گیا کہ آپ کی حضور کی سواری کی گردن اور میری سواری کی گردن مل گئی، پھر میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے ایسے عمل بتا دیجئے جو مجھے اللہ کے عذاب سے نجات دلا دیں اور اللہ ان کی وجہ سے مجھے اپنی جنت میں داخل کر دے؟ حضور اکرم ص نے فرمایا، اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پابندی اور آداب کی پوری رعایت کے ساتھ ادا کرتے رہو، فرض زکات ادا کرتے رہو، حج کرو، عمرہ کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اس پر نگاہ رکھو کہ اپنے ساتھ لوگوں کے کس طرح کے معاملہ کو تم پسند کرتے ہو، ویسا ہی معاملہ تم بھی لوگوں کے ساتھ کرو، اور جن چیزوں کو تم نہیں پسند کرتے کہ تمہارے ساتھ دوسرے لوگ کریں وہ تم بھی لوگوں کے ساتھ نہ کرو۔

بنی عامر کے ابو زین عقیلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میرے والد بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان میں حج کرنے کے لیے سفر وغیرہ کی سکت باقی نہیں رہ گئی ہے، وہ اسلام بھی قبول کر چکے ہیں، تو کیا میں

ان کی طرف سے حج کر لوں؟ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کر لو۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں فرمایا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ، نماز قائم کرو، زکات دو حج اور عمرہ کرو اور سیدھے طریقہ پر رہو، تمہارے لیے بھی ہر چیز درست اور سیدھی ہو جائے گی۔ لیکن یہ اور اس مفہوم کی دوسری احادیث دین میں کسی اصول و ضابطہ کے لیے کوئی حجت نہیں بن سکتیں، خصوصاً جب کہ ان روایتوں کی اسانید بھی کمزور ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بہت سی دوسری روایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمرہ نفل ہے، واجب و فرض نہیں ہے۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا یہ بھی واجب ہے؟ آن حضور نے فرمایا کہ نہیں، ہاں اگر عمرہ کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ ابو صالح حنفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔ اس لیے میرے نزدیک آیت مذکورہ کی قرار توں میں راجح قرار ت "العمرة" پر نصب کی ہے، اور اقوال میں راجح قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے جو ان سے علی بن ابی طلحہ نے نقل کیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے شروع کرنے کے بعد انہیں پورا کرنے کا آیت میں حکم دیا ہے کہ اب دونوں کو ان کے تمام حدود اور سنتوں کی رعایت کے ساتھ ادا کیا جائے اور عمرہ کے سلسلے میں راجح قول یہ ہے کہ یہ نفل ہے، فرض نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت عمرہ حدیبیہ کے موقع پر نازل کی تھی جب آپ کو مشرکین مکہ نے مکہ کے داخلہ سے روک دیا تھا، جب کہ آپ اور آپ کے ساتھ صحابہ احرام باندھے ہوئے تھے۔ اگر بیت اللہ تک آپ حضرات کو جانے دیا جاتا پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی، لیکن اب یہ سوال تھا کہ اس احرام سے نکلنے کی کیا صورت ہے، یا کسی بھی شخص کو اگر بیت اللہ جانے سے راستے میں روک دیا گیا اور وہ احرام باندھ چکا ہے تو احرام سے نکلنے کی کیا صورت ہوگی؟ ارشاد ہے "فَإِنْ أُحْضِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ" پھر اگر رکنا پڑ جائے تو جو بھی قربانی کا جانور سیر ہو (مفسرین سے آیت کے مفہوم کی تعیین کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں کہ "أُحْضِرْتُمْ" درکنا پڑ جانا، سے کیا مراد ہے کہ جو شخص اس صورت حال سے دوچار ہو اسے اجازت ہے کہ جو بھی قربانی کا جانور سیر ہو اس کی قربانی کر دے؟۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کے مفہوم میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جو محرم کو احرام سے متعلق فریضہ کی ادائیگی اور بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "حصر" روکنے کے معنی میں ہے جس شخص کے لیے بھی کوئی عذر حج یا عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے اسے اپنی قربانی کا جانور وہیں سے بھیج دینا چاہیے جہاں وہ رک گیا ہے۔ آپ نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص مرض یا کسی بھی عذر شرعی کی وجہ سے رک گیا تو اس سے حج یا عمرہ کی ادائیگی کا قرض باقی رہے گا اور اسے چاہیے کہ جو بھی قربانی کا جانور اسے سیر ہے اسے بھیج دے اور یوم النحر (دس ذی الحجہ) سے پہلے نہ سر منڈوائے اور نہ احرام کھولے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ہر وہ چیز جو رکاوٹ کا باعث بن جائے" احصار کے مفہوم میں داخل ہے، "قتادہ نے فرمایا کہ "روکنے والی چیزیں خوف اور مرض ہیں" مذکورہ بالا اقوال کے مطابق عذرہ اور براہیم رحمہما اللہ سے بھی تفسیر منقول ہے۔ ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں نقل ہے کہ کسی شخص نے حج یا عمرہ کے لیے احرام باندھا، لیکن درمیان میں بیمار پڑ گیا اور بیماری بھی ایسی تھی جس نے بیت اللہ تک پہنچنا اس کے لیے مشکل بنا دیا، یا اسی طرح کا اور کوئی عذر پیش آ گیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس حج اور عمرہ کی آئندہ قضا کرے اور اس وقت قربانی ذبح کر کے احرام کھول دے۔ آیت کا یہ مفہوم مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ کلام عرب میں "احصار" کے معنی "کسی سبب و عذر کا روکنے کا باعث بن جانا ہے" جیسے مرض یا اسی طرح کے اور بہت سے اعذار۔ زبردستی کسی چیز سے روک دینا اس کے مفہوم سے خارج ہے۔ اس کے مفہوم میں مرض، سانپ وغیرہ کا ڈس لینا، زخمی ہو جانا، سفر خرچ کا کم ہو جانا یا سواری کا ٹوٹ جانا شامل ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی کو دشمن نے روک دیا اور بیت اللہ تک پہنچنے نہیں دیا یا قید خانہ میں بند کر دیا یا اسی طرح کی کوئی اور صورت پیش آئی جس میں کسی غالب اور قوی تر انسان یا جانور نے زبردستی مزاحمت کی اور محرم کو بیت اللہ تک جانے نہیں دیا تو اس کے لیے عرب مجرد کا صیغہ "حصر" استعمال کرتے ہیں، مزید کا "احصا" استعمال نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی آیت "وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا" (اور جہنم کو ہم نے کافروں کا قید خانہ بنا ہی رکھا ہے) سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ دشمن کے محاصرہ و مزاحمت کے مواقع کے لیے بکثرت کلام عرب میں اس کا استعمال ہوا ہے، "الْعَدُوُّ وَالْحَاصِرُ" ، "هُوَ فَحْصُورُونَ" ، "حَوْصِرَ الْعَدُوُّ" ، تو استعمال ہوا ہے لیکن کہیں بھی "أَحْصَرَ الْعَدُوُّ" نہیں مل سکتا۔ اس کے بالمقابل مرض یا خوف یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذر کی وجہ سے رک جانے کے لیے "أَحْصَرَ الْمَرْجُلُ" استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے آیت میں مرض، خوف یا اس طرح کے دوسرے اعذار کا بیت اللہ تک پہنچنے سے مانع آنا تو اصل مفہوم ہوگا، لیکن تبعاً دشمن یا کسی غالب و قوی کے روک دینے کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا اور حکم دونوں صورتوں میں یہی رہے گا کہ اگر بیت اللہ تک وہ نہ پہنچ سکا تو اپنی قربانی کا جانور بھیج دے اور جب قربانی اپنے مقام پر پہنچ کر ذبح کر دی جائے تو احرام کھول دے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "اگر تمہیں دشمن یا کوئی غالب و قوی انسان بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دے" ان حضرات کا خیال ہے کہ جسمانی اعذار، مثلاً بیماری، یا زخم وغیرہ۔ آیت کے الفاظ "فَإِنْ أَحْصَرَ تَدُّ" میں داخل نہیں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "حصر" کا مفہوم تو صرف دشمن کے روکنے ہی کی صورت میں پایا جاتا ہے، پھر بھی اگر کوئی بیماری کی وجہ سے رک گیا تو اس اجازت سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر اس کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے تو جہاں رکا ہوا ہے وہیں بغیر قربانی کے احرام کھول دے اور اگر قربانی ساتھ ہے تو اس وقت تک احرام نہ کھولے جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ لگ جائے آپ نے فرمایا کہ جب روک دیتے جانے والے محرم نے قربانی بھیجی تو اب اس پر آئندہ حج یا عمرہ فرض نہیں رہتا البتہ اگر چاہے تو کر سکتا ہے۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں احرام کھول دیا تھا، قربانی ذبح کر لی تھی، سرمنڈوا لیے تھے اور بیت اللہ کے طواف اور وہاں تک قربانی کے جانور کے پہنچنے سے پہلے ہر چیز سے حلال ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کے متعلق ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی، شرکاء صلح حدیبیہ کے کسی فرد کو حج یا عمرہ کی قضا کا یا ان کے

اعمال میں سے کسی ایک کے دوبارہ کرنے کا حکم دیا ہو۔ ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں محرم احرام کھول دے گا اور ہر چیز سے حلال ہو جائے گا، اور جہاں اسے روکا گیا ہے وہیں اپنا سر منڈائے اور اپنی قربانی کا جانور ذبح کر لے، اس پر اس حج کی قضا واجب نہیں ہے، البتہ اگر اس نے اس سے پہلے کبھی حج ہی نہیں کیا ہو تو اس کے لیے قرینۃ حج کی ادائیگی واجب کہ شرائط پائی جاتی ہوں، ضروری ہے آپ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک اگر کسی کو حج کرنے سے دشمن نے نہیں روکا، بلکہ مرض یا اس جیسے کسی عذر کی وجہ سے چھوڑنے پر مجبور ہوا تو اسے ناگزیر امور انجام دے لینے چاہئیں اور فدیہ دینا اور اپنے احرام کو عمرہ میں تبدیل کر لینا چاہیے۔ البتہ اسے اگلے سال حج کرنا چاہیے اور قربانی کرنی چاہیے۔ آیت کی اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس موقع پر نازل ہوئی تھی جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بیت اللہ جانے سے روک دیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضور اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے قربانی کے جانور کے ذبح کرنے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دشمن کے روک دینے کے موقع پر نازل کی، اس لیے جس خاص موقع کے لیے نازل ہوئی اسی پر اسے محمول کیا جائے گا، اس کے مفہوم میں تبدیلی مناسب نہیں۔ مریض بھی جب شدت مرض کی وجہ سے چل پھر نہ سکتا ہو اور اسی وجہ سے میدان عرفہ تک بھی نہ جاسکا ہو تو وہ بھی ان لوگوں میں سمجھا جائیگا جن کا حج چھوٹ جاتا ہے اور اس لیے اسے بھی چاہیے کہ قاعدہ کے مطابق احرام کھول دے۔ اسے ”محصر“ نہیں کہا جائے گا جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے۔

میرے نزدیک اس کی راجح تفسیر یہ ہے کہ ”اگر دشمن کا خوف، مرض یا کوئی بھی عذر تمہارے بیت اللہ تک پہنچنے میں مانع بنے یعنی تمہارا خوف یا مرض تمہیں اس مرحلہ پر لا کھڑا کرے کہ تم اپنے آپ کو بیت اللہ تک جانے سے روک لو اور حج و عمرہ کے وہ اعمال جو تم پر واجب تھے ان کی انجام دہی سے تم رک جاؤ تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اس کی قربانی کر دو“ ”أُحْصِرْتُمْ“ کا استعمال اسی لیے کیا۔ بولتے ہیں ”أُحْصِرْتُمْ خَوْفِي مِنْ فُلَانٍ عَنْ يَقَارِيكَ“ (فلاں شخص کے خوف نے مجھے تم سے ملنے نہیں دیا)، مرض کے ساتھ بھی اس کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے، یعنی مجھے مجبور کر دیا کہ میں تم سے نہ ملوں۔ لیکن اگر مانع و مزاحم انسان ہو تو اس موقع کے لیے ”أُحْصِرْتُمْ فُلَانٌ عَنْ يَقَارِيكَ“ (مجھے فلاں شخص نے تم سے ملنے نہیں دیا، استعمال کرتے ہیں۔ اگر آیت کا مفہوم وہی ہوتا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے لیا ہے تو آیت میں ”فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ“ کے بجائے ”فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ“ ہونا چاہیے تھا۔ آیت میں ”أُحْصِرْتُمْ“ کے صیغہ کے استعمال سے یہ واضح ہے کہ ”النسانی فزاحمت و مانعت“ مراد نہیں ہے، بلکہ انسان یا دشمن کے خوف کا رکاوٹ بن جانا مراد ہے۔ اس کے علاوہ آیت ”فَإِذَا أُمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ“ (لیکن جب تم حالت الطمینان میں ہو تو جو شخص عمرہ سے مستفید ہوا اسے حج سے ملا کر اسے بھی ہماری راستہ کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ امن خوف کے دور ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورتیں جن میں احرام کے بعد النسانی فزاحمت اور رکاوٹ تو پائی جاتی ہے لیکن خوف و خطرہ نہیں ہے تو محرم کے لیے ضروری ہے کہ احرام نہ کھولے، بلکہ حج یا عمرہ جس کا بھی اس نے احرام باندھا ہے

اسے پورا کرے۔ مثال کے طور پر حاکم یا بادشاہ رکاوٹ بن رہا ہے، لیکن نہ رکنے کی صورت میں اس کی سزا وغیرہ کا کوئی خوف نہیں ہے، یا والد یا عورت کا شوہر مرزا تم ہے، لیکن نہ رکنے کی صورت میں کوئی خوف و خطرہ نہیں تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں محرم پر لازم ہے کہ جس کا احرام باندھا ہے اسے انجام دے اور احرام نہ کھولے، کیونکہ وہ ”محصر نہیں ہے۔ آیت کے اس مفہوم کے پیش نظر ہمارا یہ خیال ہے کہ ہر وہ مانع جس سے محرم دو چار ہو اور وہ بیت اللہ تک پہنچنے سے محرم کو روک دے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

”فَمَا اسْتَسْرَرَ مِنَ الْهَدْيِ“ (تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو) کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد بکری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن، قتادہ، عطاء، سدی، علقمہ، ابراہیم، ابو جعفر، شعبہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ سے اس کی روایت ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ آیت میں ”قربانی کے جانور“ سے مراد آٹھ اقسام ہیں، یعنی اونٹ، گائے، بھیر اور بکری (سب کی نر بادہ)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں سب سے اعلیٰ اونٹ کی قربانی ہے، اوسطاً گائے ہے اور ادنیٰ بکری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ محصر اگر خوش حال ہے تو قربانی اونٹ کی کرنی چاہیے، ورنہ گائے یا بکری کی کرنی چاہیے۔ شعبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس سے شعائر اللہ کی عظمت ہو وہی افضل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے بکری کے سوا دوسرے قربانی کے جانور مثلاً اونٹ، گائے مراد ہیں۔ یہ قول ابن عمر عائشہ رضی اللہ عنہا، مجاہد، طاؤس اور عروہ رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آیت کے الفاظ ”جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو“ سے مراد اونٹ اور گائے ہی ہیں سے انتخاب ہے کہ جو بھی میسر آجائے ذبح کرے۔

میرے نزدیک راجح قول پہلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری سہولت اور آسانی پر چھوڑا ہے۔ اس لیے کسی چیز کو ہم اپنی طرف سے خارج نہیں کر سکتے۔ اور بکری بھی قربانی کا جانور ہے۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، لیکن اس پورا کرنے میں اگر کوئی چیز مانع بن جائے، مثلاً مریض ہو جاؤ، کوئی عضو ٹوٹ جائے یا دشمن کا خوف ہو، اور تم ان اعذار کی وجہ سے احرام کھولنا چاہو تو اس کی تمہیں اجازت ہے، تمہیں اس صورت میں جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کر کے احرام کھول لو۔

”وَلَا تَقْرَبُوا رءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ“ اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے اپنے سر نہ منڈاؤ، یعنی اگر تمہیں رکنا پڑ جائے اور تم احرام کھولنا چاہو تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کر دو، البتہ جب قربانی کا جانور اپنے مقام پر پہنچے اور متعینہ تاریخ میں اس کی وہاں قربانی ہو جائے پھر احرام کھولو۔ احرام کھولنے کی تعبیر ”سر منڈاؤ“ سے کی ہے، کیونکہ یہی وہ آخری عمل ہے جس کے ذریعہ محرم حلال ہوتا ہے ”محل صدی“ (قربانی کے جانور کا مقام) کیا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ”محصر کی قربانی کا مقام، کہ جہاں قربانی کے پہنچنے سے پہلے وہ احرام نہیں کھول سکتا، اور اسے سر منڈاؤ کی اسی وقت اجازت ہے جب اس کی قربانی وہاں پہنچ جائے، مختلف صورتوں میں مختلف ہیں، اگر دشمن کے خطرے کی وجہ سے اسے رکنا پڑا ہے، اور

دشمن ہی قربانی کو اس کی اصل جگہ ذبح کرنے سے مانع بنا ہے تو حرم سے باہر یا حرم کے اندر جہاں بھی اسے روک دیا گیا ہے وہیں اپنی قربانی ذبح کر لے اور حلال ہو جائے، لیکن اگر رکاوٹ دشمن نے نہیں ڈالی ہے بلکہ مرض وغیرہ کی وجہ سے اعمال حج کرنے سے معذور و مجبور ہے، تو جب تک بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی نہ کر لے گا حلال نہیں ہو سکتا۔ یہ ان حضرات کا قول ہے جنہوں نے کہا تھا کہ آیت ”أُحْصِرْتُمْ“ میں ”أُحْصِرْتُمْ“ سے مراد صرف دشمن کا رکاوٹ بنا ہے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آں حضور اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں ہی احرام کھول دیا تھا، پھر آپ حضرات نے قربانی کی اور سرمنڈوا لیتے اور بیت اللہ کے طواف اور قربانی کے جانور کے اپنے مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی ہر چیز سے حلال ہو گئے۔ اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے بعد آں حضور نے اپنے کسی صحابی کو جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے کسی چیز کے بھی قضا یا اسے دوبارہ ادا کرنے کا حکم دیا ہو۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فتنہ کے زمانہ میں عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لیے نکلے، اور فرمایا کہ اگر مجھے بیت اللہ جانے سے روکا گیا تو ہم بھی وہی کریں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے عمرہ کا احرام باندھا، کیونکہ صلح حدیبیہ کے سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عمرہ ہی کا احرام باندھا تھا۔ پھر ابن عمر نے اپنے معاملہ پر غور کیا اور فرمایا کہ دونوں (حج و عمرہ) کا معاملہ ایک ہی ہے، اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے عمرہ کے ساتھ حج بھی اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔ بیان کیا کہ پھر آپ نے ایک طواف کیا، آپ کا خیال تھا کہ یہی دونوں کے لیے کافی ہے، اور قربانی کی۔ اس روایت کے راوی ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص دشمن کے ذریعہ روک دیا گیا ہو تو اس کا مسئلہ ہمارے نزدیک بھی یہی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو روکا گیا تھا۔ لیکن اگر کسی کو دشمن نے نہیں روکا، بلکہ وہ کسی اور مجبوری کی وجہ سے بیت اللہ تک نہ پہنچ سکا تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ ہر چیز سے حلال ہو جائے گا، اسے جہاں روکا گیا ہے وہیں سرمنڈالینا اور اپنی قربانی کا جانور ذبح کر لینا چاہیے، اس پر اس حج کی قضا بھی واجب نہیں، البتہ اگر اس نے کبھی اس سے پہلے حج ہی نہیں کیا تھا تو اس پر فرض حج باقی رہے گا۔

ابن خرابہ مخزومی حج کے ارادہ سے نکلے اور راستے میں مرگی آگئی تو ان کے متعلق عبداللہ بن عمر، مروان بن حکم اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے فتویٰ دیا کہ امور حج میں جو اعمال ناگزیر ہیں ان سے ابتداء کر لیں اور فدیہ دینا۔ پھر اپنے حج کے اس احرام کو عمرہ میں تبدیل کر لیں۔ البتہ اگلے سال پھر حج کریں اور اس میں قربانی کریں۔ ابن وہب بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، ہمارے نزدیک یہی اس شخص کا حکم ہے جسے دشمن کے خطرہ کے سوا کسی اور عذر کی وجہ سے رکنا پڑا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بھی شخص اگر احرام باندھنے کے بعد مرض یا کسی اور عذر کی وجہ سے رک گیا، یا چاند کا معاملہ اس پر صاف نہ ہو تو وہ ”محصر“ ہے اس کے لیے بھی وہ امور ضروری ہیں جو محصر کے لیے ضروری ہیں، یعنی طواف اور صفا و مروہ کے درمیان آمد و رفت سے پہلے احرام نہ کھولے۔ پھر اگلے سال حج کرے اور قربانی کرے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول بیان کیا گیا کہ احرام باندھنے کے بعد اگر رکاوٹ دشمن نے ڈالی ہے

تو آیت میں ”سھل ھدی“ (قربانی کا مقام) یہ ہے کہ جہاں سے روکا گیا ہے وہیں قربانی ذبح کر دے۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ملتی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر قربانی کے جانور وادی ثنیہ کے پہاڑ کی پشت پر تھے تو مشرکین نے مزاحمت کی اور آں حضور کو بیت اللہ سے روکا بیان کیا کہ پھر آں حضور نے وہیں قربانی کی جہاں آپ کو روکا گیا تھا، یعنی مقام حدیبیہ میں۔ اور آپ نے اپنا سر منڈایا۔ بہت سے صحابہ نے آپ کی پیروی کی، اور جب آں حضور کو سر کے بال منڈانے دیکھا تو اپنے سر کے بال بھی منڈائیے لیکن بعض اس امید پر رہے کہ ممکن ہے انھیں بیت اللہ کے طواف کا موقع مل جائے۔ پھر آں حضور نے فرمایا، اللہ منڈائے والوں پر رحم کرے۔ عرض کی گئی، یا رسول اللہ! بال چھوٹے کرنے والوں کو بھی اپنی دعا میں شریک فرمائیں۔ آں حضور نے دوبارہ وہی دعا کی، اللہ منڈائے والوں پر رحم کرے۔ عرض کی گئی، یا رسول اللہ! بال چھوٹے کروانے والوں کو بھی دعائیں شریک کر لیں۔ آں حضور نے فرمایا، اور بال چھوٹے کروانے والوں پر بھی اللہ رحم کرے۔ مسور بن خزیمہ رضی اللہ عنہ اور مروان بن حکم کی روایت میں یہ تفصیل ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور مشرکین قریش کے درمیان صلح کی دستاویز لکھی۔ اور یہ صلح حدیبیہ کے سال مقام حدیبیہ میں ہوئی تھی۔ تو اپنے صحابہ سے آپ نے فرمایا کہ اب اٹھو اور اپنی قربانیاں ذبح کر کے سر منڈالو لیکن اللہ گواہ ہے، ان میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا۔ آں حضور نے انھیں تین مرتبہ یہ حکم دیا، لیکن جب کوئی بھی نہیں اٹھا تو آپ خود اٹھ گئے اور ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خیمہ میں جا کر اس معاملہ کا ان سے تذکرہ کیا۔ ام المؤمنین نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ خود باہر تشریف لے جائیں اور اپنی قربانی کا اونٹ ذبح کر لیں اور کسی سے ایک لفظ بھی کچھ نہ فرمائیں۔ پھر اپنے حجام کو بلوا کر اپنا سر منڈا لیں۔ چنانچہ آں حضور کھڑے ہوئے اور باہر تشریف لائے۔ کسی سے ایک لفظ بھی کچھ نہیں فرمایا اور قربانی وغیرہ کر لی۔ جب صحابہ نے یہ دیکھا تو وہ بھی اٹھ گئے اور اپنی قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے لگے۔ پھر آپس ہی میں بعض نے بعض کا سر منڈا۔ اس وقت اتنی ریل پیل ہوئی کہ خطرہ تھا کہ کوئی زخمی نہ ہو جائے۔ انھیں روایات کی بنیاد پر ان حضرات کا کہنا ہے کہ جب مقام حدیبیہ پر مشرکین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا اور بیت اللہ نہیں جانے دیا تو آں حضور اور آپ کے صحابہ نے وہیں قربانی کی اور حلال ہو گئے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ حدیبیہ حدودِ حرم میں داخل نہیں ہے، اس سے واضح طور پر سمجھیں آتا ہے کہ آیت میں ”حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ“ میں ”در مقام قربانی“ سے مراد یہ ہے کہ اسے ذبح کر کے کھانے اور اس سے نفع حاصل کرنے کے قابل بنا دے، گویا یہ لفظ آیت میں محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، یعنی ”جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ لگ جائے محرم کو احرام نہ کھولنا چاہیے“ ایک حدیث میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو کسی نے صدقہ میں گوشت دیا تھا، اب وہ گوشت ان کی ملکیت تھا، وہ جسے چاہے دے سکتی تھیں، ایسا شخص بھی ان کی اجازت سے اسے کھا سکتا تھا جسے صدقہ لینا جائز نہیں۔ چنانچہ جب حضرت بریرہ وہی گوشت جو انھیں کسی نے صدقہ کے طور پر دیا تھا آں حضور کے پاس لے کر آئیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ ”اپنی جگہ پہنچ چکا ہے“ یعنی پہلے یہ صدقہ تھا، لیکن جب مستحق سے اسے وصول کر لیا تو اب وہ صدقہ نہیں رہا، وہ اپنے ٹھکانے لگ چکا ہے اور صدقہ کے طور پر وصول کرنے والا اسے جسے چاہے دے سکتا ہے۔ آں حضور نے اس کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ گوشت بریرہ کے

لئے صدقہ تھا، اور ہمارے لیے حد یہ ہے۔
 دوسرا قول یہ ہے کہ حصہ کے لیے "محل ہدی" (قربانی کی جگہ) حرم ہے، حرم سے باہر اپنی قربانی ذبح کرنے سے وہ احرام سے نہیں نکل سکتا، کیونکہ اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی "محل ہدی" نہیں۔ عمرو بن سعید بن مسعودی کے متعلق روایت ہے کہ آپ عمرہ کا احرام باندھ کر نکلے جب مقام ذات الشقوق پر پہنچے تو بچھڑنے لگے اور ادائیگی عمرہ دشوار ہو گئی آپ کے ساتھی راہ دیکھنے لگے کہ کوئی مل جائے تو انکے متعلق مسئلہ پوچھا جائے۔ ان کی باتوں سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوئی۔ انہوں نے آپ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنی قربانی کا جانور وہ (حرم میں) بھیج دیں، اور تم سے مل کر لیں کہ فلاں روز فلاں وقت تم ان کی قربانی ذبح کر دو گے۔ اور قربانی ذبح ہونے کے اس متعین وقت کے بعد وہ احرام کھول دیں۔ پھر آئندہ ان پر اس عمرہ کی قضا واجب ہے۔ یہی روایت عبدالرحمن بن یزید سے اس طرح منقول ہے کہ ہم عمرہ کا احرام باندھ کر نکلے، ہمارے ساتھ اسود بن یزید بھی تھے۔ جب ہم نے ذات الشقوق پر پڑا دیکھا تو ہمارے ایک ساتھی کو بچھڑنے لگا۔ وہ اس کی وجہ سے شدید تکلیف و دشواری میں مبتلا ہو گئے۔ ہم بڑی الجھن میں پڑ گئے کہ ان کا کیا کریں ہمارے چند ہم قافلہ راستے پر آئے تو ایک قافلہ آتا ہوا ملا جس میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ہم نے آپ سے عرض کی کہ اے ابو عبدالرحمن! ہمارے ایک ساتھی کو بچھڑنے لگا ہے، ہم ان کا کیا کریں؟ فرمایا کہ وہ اب تمہیں اپنی قربانی کے جانور کی قیمت دے دیں، اور تم ان سے قربانی کیلئے دن اور وقت متعین کر لو، پھر جب ان کی قربانی ذبح ہو جائے تو وہ احرام کھول لیں اور ان پر آئندہ عمرہ کی قضا ضروری ہے۔ یہ روایت مختلف واسطوں سے منقول ہے۔ عمارہ بن عمیر اپنی روایت میں بیان کرتے ہیں کہ اس پر اعتماد کے لیے یہی کافی ہے کہ عبدالرحمن بن یزید رحمۃ اللہ علیہ اسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ اگر کسی شخص نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا اور پھر وہ شدید مرض یا کسی ایسے عذر کی وجہ سے جو بیت اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بن گیا، رک گیا تو اسے جو بھی قربانی کا جانور سیر آئے ذبح کر دینا چاہیے، خواہ وہ بکری ہو یا اس سے بڑا قربانی کا کوئی جانور۔ یہ جانور اس کی طرف سے ذبح کیا جائے گا اور اگر بیچ اس کا پہلا تھا تو آئندہ اس فریضہ کی ادائیگی اسے کرنی چاہیے، لیکن اگر نفعی حج یا عمرہ تھا تو اس کی قضا واجب نہیں۔ پھر اگر اس نے حج کا احرام باندھا تھا تو اس کی قربانی کا مقام دسویں ذی الحجہ ہے، اور اگر عمرہ کا احرام تھا تو اس کی قربانی کا مقام یہ ہے کہ جب بیت اللہ پہنچے تو قربانی کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آیت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر کسی محرم کو رک جانا پڑا تو اسے اپنی قربانی کا جانور بھیج دینا چاہیے، جب وہ جانور اس کی طرف سے ذبح کر دیا جائے تو احرام کھول دے، قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے اسے احرام نہ کھولنا چاہیے۔ مذکورہ بالا قول عطار اور ساری سے بھی منقول ہے۔

جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ قربانی کا مقام حرم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہدی (قربانی) کا وہ جانور جو خانہ کعبہ کے لیے مخصوص ہے اور اونٹوں کے ذریعے فرمایا کہ "وَمَنْ يَعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ لَكُمُ فِيهَا مَنَافِعٌ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ يَحُلُّهَا إِلَىٰ الْبَيْتِ الْعَتِيقِ" (اور جو کوئی دین خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا تو یہ دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے۔ تمہارے لیے ان سے فوائد حاصل کرنا رجا ہے) ایک مدت متعین تک، پھر اس کے ذبح کا موقعہ بیت عتیق..... کے قریب ہے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہدی (قربانی) کا وہ جانور

جو خانہ کعبہ کے لیے بھیجا جائے، اس کا مقام حرم ہی بتایا ہے، اس لیے حرم کے سوا اس کا کہیں اور ذبح کرنا درست نہیں ہوگا۔ جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صلح حدیبیہ کے موقع پر طرز عمل کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں روایتوں سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ آں حضور کے قربانی کے جانور حد و حرم ہی میں ذبح ہوئے تھے۔ ناجیہ بن جندب اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ جانے سے روکا گیا تو میں نے حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ! قربانی کے جانور آپ میرے ساتھ کر دیں، تاکہ ہم اسے حرم کے اندر ذبح کرا سکیں۔ آں حضور نے فرمایا کہ یہ تم کس طرح کر سکو گے؟ میں نے عرض کی کہ میں اسے ایسے راستوں سے لے جاؤں گا کہ مشرکین روک نہیں سکیں گے۔ چنانچہ میں نے حرم کے حدود میں لا کر قربانی کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آں حضور نے قربانی حد و حرم میں کی تھی۔ بعض مفسرین نے ان دونوں تفسیروں سے ایک الگ راہ آیت کی تفسیر کی نکالی ہے۔ ان کے خیال میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”اے مسلمانو! اگر تمہیں حج کی ادائیگی سے روک دیا گیا، اور خواہ مرض کے نتیجے میں یا دشمن کے خوف کے نتیجے میں، تم اعمال حج ادا کرنے پر قادر نہ رہے اور میدان عرفہ میں قیام بھی چھوٹ گیا تو تمہارا حج چھوٹ گیا ہے اس کے بجائے جو قربانی بھی تمہیں میسر ہو اسے پیش کر دو اور آئندہ چھوٹے ہوئے حج کی قضا کر لو“ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ جو شخص حج کی ادائیگی، مرض یا کسی بھی عذر کی وجہ سے، نہ کر سکا اس کے لیے احرام کھولنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان قاعدہ کے مطابق آمد و رفت (سعی) نہ کر لے، لیکن اگر اس میں مقامات حج پر حاضری کی طاقت ہے تو وہ محصر نہیں کہلائے گا، بلکہ اسے حج کرنا ہوگا۔ عمرہ کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس میں ”احصار“ کی کوئی صورت نہیں، اس کا احرام اگر کسی نے باندھا ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد ہی حلال ہوگا، کیونکہ اس کا کوئی متعین وقت نہیں ہے، ہر وقت ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عمرہ کا احرام باندھنے والا آیت کے مفہوم میں داخل نہیں ہے، آیت میں مسئلہ صرف حج کا بیان ہوا ہے۔

آیت کی تفسیر میں اس حد تک تو مفسرین کی اس جماعت کا اتفاق ہے، لیکن اس کے بعد کی تفصیلات میں انھیں حضرات کے اقوال پھر مختلف ہو گئے ہیں۔ ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ جس طرح مرض کی صورت میں ”احصار“ کا مفہوم نہیں پایا جاتا، یعنی مریض اگر مقامات حج پر حاضری کی قدرت نہیں رکھتا تو اس وقت تک احرام کھولنا اس کے لیے جائز نہیں جب تک وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی نہ کر لے، اسی طرح اب دشمن کی رکاوٹ ڈالنے (احصار) کی صورت بھی باقی نہیں ہے۔ ابن عباس اور عائشہ رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل ہے۔

دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ دشمن کا بیت اللہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بننا (احصار) آج بھی موجود ہے اور اس کی صورت جس طرح پہلے ممکن تھی اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں حج سے روک دیا جائے، یہاں تک کہ حج چھوٹ جائے تو وہ قربانی کا جانور پیش کر دو جو تمہیں میسر ہو۔ سالم بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حج کے سلسلے میں اس طرح کی قید لگانا پسند نہیں کرتے تھے، آپ فرماتے کہ تمہارا رے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کافی ہے کہ اگر کسی کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا جائے تو بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر لے اور پھر ہر چیز سے حلال ہو جائے۔ اس کے بعد دوسرے سال حج کرے اور قربانی کرے، لیکن اگر قربانی نہ میسر آئے تو اس کے بجائے روزے رکھ لے۔ ایک روایت نافع کی ابن عمر

رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی ہے۔ آپ کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات گذرتے ہوئے، ابن خرابہ سے ہوئی، وہ اس وقت مقام سقیہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ان کا کوئی عضو ٹوٹ گیا ہے۔ انھوں نے آپ سے اس کے متعلق فتویٰ پوچھا، کیونکہ حج کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے احرام نہ کھولیں، ہاں اگر تکلیف ہے تو دوڑا کر سکتے ہیں۔ اور جو قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کر دیں۔

سالم بن عبد اللہ کی ایک روایت میں آپ سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا، حج کا احرام باندھنے کے بعد اگر کسی شخص کو خوف، مرض یا اسی طرح کے کسی اور عذر کی وجہ سے رک جانا پڑا تو علاج معالجہ میں ہر وہ چیز وہ استعمال کر سکتا ہے جو ضروری ہو، صرف عورت اور خوشبو اس کے لیے حلال نہیں ہوگی جس فدیہ کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے، یعنی روزہ یا صدقہ یا قربانی، اسے ادا کرے۔ پھر اگر اسی حالت میں اس کا حج چھوٹ گیا، یا مزدلفہ کی فجر سے پہلے میدان عرفہ کا قیام چھوٹ گیا جب بھی اس کا حج چھوٹ جاتا ہے، تو یہ حج عمرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، اب اسے مکہ معظمہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرنی چاہیے، اگر ساتھ میں قربانی کا جانور ہے تو مکہ میں مسجد حرام کے قریب اسے ذبح کرنا چاہیے، پھر اپنا سر منڈالے یا بال چھوٹے کر لے۔ اس کے بعد عورت، خوشبو اور دوسری چیزیں اس کے لیے حلال ہو جاتی ہیں۔ آئندہ اسے اس چھوٹے ہوئے حج کی قضا کرنی پڑے گی اور جو جانور آسانی سے مل سکے اس کی قربانی کرنی ہوگی۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول یہ روایتیں اس صورت سے متعلق تھیں جب محرم مرض یا اسی طرح کے کسی اور عذر کی وجہ سے حج نہ کر سکا ہو۔ لیکن اگر دشمن نے بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا ہو تو اس سلسلے میں آپ کا بھی وہی مسلک ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہم اس سے پہلے نقل کر آئے ہیں۔

نافع رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جس سال حجاج نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف فوج کشی کی تھی اس سال ابن عمر رضی اللہ عنہ حج کے ارادے سے نکلے۔ آپ کے دو صاحبزادے سالم اور عبد اللہ نے آپ سے عرض کی، اگر آپ اس سال حج نہ کریں بھی کوئی حرج نہیں، ہمیں خطرہ ہے کہ اس سال جنگ ہوگی اور آپ بیت اللہ تک پہنچ نہیں سکیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر مجھے بیت اللہ تک جانے نہ دیا گیا تو میں بھی وہی کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کیا تھا جب آپ کو کفار قریش نے روکا تھا۔ آں حضور نے سر منڈایا تھا اور احرام کھول کر واپس آگئے تھے۔

عمرہ کے متعلق جو ان حضرات کے حوالہ سے ہم یہ نقل کر آئے ہیں کہ اس میں "احصار" کی کوئی صورت ہی نہیں، تو اس سلسلے میں ابو العلاء بن شخیر سے روایت ہے کہ میں عمرہ کا احرام باندھ کر نکلا، راستے میں اپنی سواری سے گر پڑا اور میرا پاؤں ٹوٹ گیا۔ پھر میں نے ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں اس سے متعلق مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا تو آپ حضرات نے فرمایا کہ عمرہ کا کوئی متعین وقت نہیں ہوتا، اس لیے جب تک بیت اللہ کا طواف نہ کر لو احرام نہ کھولو۔ بیان کیا کہ پھر میں مقام وثنیہ یا اس کے قریب سات یا آٹھ مہینے تک (صحت کے انتظار میں) ٹھہرا رہا اور پھر کہیں جا کے عمرہ ادا کیا۔ آپ حضرات سے اس مضمون کی متعدد روایتیں ہیں۔ ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہے، آپ نے

فرمایا کہ ایسی صورت میں اس وقت تک احرام نہ کھولنا چاہیے جب تک بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی نہ کر لے، پھر سر منڈائے یا بال چھوٹے کروائے (حلال ہونے کے لیے) اور اس صورت میں اس پر کسی چیز کی قضا وغیرہ واجب نہیں۔

ان تمام احوال میں راجح قول یہ ہے کہ آیت میں اگر تم روک دیتے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو (اسے پیش کر دو) اور اس وقت تک سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ جائے، میں ہر محصر کا حکم بیان ہوا ہے، خواہ اس نے عمرہ کا احرام باندھا ہو یا حج کا، اور اس کی قربانی کا مقام اسی جگہ کو قرار دیا ہے جہاں سے روکا گیا ہے، قربانی کے ”محل“ سے مراد ”جائے ذبح و قربانی“ ہے، قربانی اپنے مقام پر پہنچ جائے، یعنی ذبح ہو جائے اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کو بیت اللہ سے روکا گیا تھا تو آپ اور آپ کے صحابہؓ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، آپ حضورؐ نے بھی قربانی کی اور آپ کے صحابہؓ نے بھی آپ کے حکم سے قربانی کی، اور بیت اللہ پہنچے بغیر احرام کھول دیا، پھر اس کی قضا دوسرے سال کی۔ آج تک سیرت نبویؐ کے کسی جاننے والے نے اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ آپ حضورؐ یا آپ کے کسی صحابیؓ نے احرام کھولنے کے بجائے اس کا انتظار کیا ہو کہ رکاوٹ دور ہو اور پھر حرم پہنچ کر بیت اللہ کے طواف اور سعی کے بعد احرام کھولا جائے۔ اس لیے خصوصاً جبکہ کوئی حدیث یا کوئی دوسری دلیل اس کے خلاف بھی نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی اتباع ہی صحیح ہوگی۔ اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی تھی جب مشرکین نے حضور اکرمؐ کو حدیبیہ میں بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا تھا۔ پھر جب کہ آپ حضورؐ کی احادیث سے بھی یہی ثابت ہے تو اس کے خلاف کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مولا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ جس شخص کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے (احرام باندھنے کے بعد) تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج واجب ہے۔ عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ابو ہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی تو ان حضرات نے اس کی تصدیق کی۔ اس حدیث کو حضور اکرمؐ کے اس عمل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ جب مشرکین نے صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کو بیت اللہ کے داخلہ سے روکا، حالانکہ آپ اور آپ کے صحابہؓ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، تو آپ نے اور آپ کے صحابہؓ نے اس وقت احرام کھول دیا تھا اور پھر دوسرے سال اس کی قضا کی تھی۔

۱۳۲۹

”فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ“
 لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے فدیہ دے۔ یعنی محرم اگر بیماری یا سر کے پھوڑے یا اس جیسی کسی اور تکلیف کی وجہ سے سر منڈانے پر مجبور ہے تو اس اچانک مجبوری کی وجہ سے وہ قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے سر منڈا سکتا ہے، البتہ اس قبل از وقت سر منڈانے کی وجہ سے اس پر فدیہ واجب ہوگا، یعنی اس کے بدلہ میں یا اسے روزے رکھنے ہوں گے یا خیرات کرنی ہوگی یا قربانی کرنی ہوگی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ ”سیرت کی تکلیف“ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مراد سر میں جو تین وغیرہ پڑ جانا ہے، یا سر کا درد ہو جائے (جس میں سر منڈانا ضروری ہو)

اور اسی طرح کی دوسری سر کی تکالیف -

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر سر منڈانے کا فدیہ قربانی یا خیرات کی صورت میں دینا ہے تو فدیہ دینے سے پہلے سر نہ منڈائے، البتہ اگر فدیہ میں روزے رکھنا ہے تو فدیہ سے پہلے سر منڈا سکتا ہے، پھر بعد میں روزے رکھے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ علقمہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے مخالف قول نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ احرام باندھنے کے بعد اگر بیت اللہ سے کسی کو روک دیا گیا تو بکری وغیرہ کی جو بھی قربانی اسے میسر ہو اسے بیچ دے، لیکن اگر قربانی کے اپنے مقام پر پہنچنے سے پہلے اس نے جلدی کی اور اپنا سر منڈا لیا، خوشبو لگائی یا کوئی اور دوا اسی طرح کی استعمال کر لی تو اس پر روزے، خیرات یا قربانی کا فدیہ واجب ہوگا۔ ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ قول سعید بن جبیر کے سامنے بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی کہتے تھے۔ یہ قول مجاہد اور قتادہ کے علاوہ ابن عمر اور علی رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ جن فدیوں کا ذکر آیت میں ہوا ہے وہ سر منڈانے سے پہلے ادا کرنے ہوں گے، یعنی اگر قبل از وقت سر منڈانے کا ارادہ ہے تو پہلے مذکورہ فدیوں میں سے کوئی ادا کر لے پھر سر منڈائے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اس کی دلیل میں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی جاتی ہے (حج کے موقع پر) آپ کا گذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا، ان کے سر میں جو تین اور ان کے اندھے بچے بہت زیادہ پیدا ہو گئے تھے، حضور اکرم نے ان سے دریافت فرمایا، تمہارے پاس ایک بکری ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ حضور نے فرمایا کہ پھر تم چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو یا تین روزے رکھ لو، اور اپنا سر منڈا لو۔

بیماری کی جن صورتوں میں شریعت نے جسم پر دوا استعمال کرنے یا سر منڈانے کی اجازت دی ہے اس میں وہ تمام بیماریاں شامل ہیں جن میں سر منڈانا بھی علاج کا جزو ہے، جیسے سرسام جس میں سر منڈا دینے سے افاقہ ہو جاتا ہے، یا اسی طرح کی اور بیماریاں۔ اسی طرح وہ زخم جو جسم پر ہو جائیں اور علاج کے لیے ان پر دوا یا خوشبو لگانی پڑے۔ اس میں پھوڑے اور دوسری جلدی بیماریاں بھی آجاتی ہیں۔ تکلیف (أذی) جو سر میں ہوتی ہے اور جس میں بال منڈانے کی اجازت ہے اس میں سر کا درد، جوؤں کی کثرت اور سر کی ہر وہ تکلیف جس کا علاج سر منڈانا ہو، یا اس سے وقتی تکلیف دور ہو جاتی ہو، تو یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”أَوْ بِهٖ أَذًی مِنْ رَأْسِہٖ“ کے عموم میں داخل ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ یہ حدیث ثابت ہے کہ یہ آیت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، صلح حدیبیہ کے موقع پر انھیں ان کے سر میں جوؤں کی کثرت کی وجہ سے تکلیف تھی۔ خود کعب بن عجرہ کی روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب سب حضرات عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے، میرے کانوں تک لٹکے ہوئے بالوں میں جو تین بھری پڑی تھیں، حال یہ تھا کہ جڑ سے نوک تک ایک ایک بال میں جو تین اور ان کے بچے لپیٹے ہوئے تھے، آپ حضور نے فرمایا، اس سے تو بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی؟ میں نے عرض کی، ہاں، یا رسول اللہ! بہت زیادہ! آپ نے دریافت فرمایا، تمہارے پاس کوئی قربانی کے قابل جانور ہے؟ میں نے عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا کہ اگر چاہو تو تین دن کے روزے رکھ لو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو چھ مسکینوں کو، ہر مسکین نصف صدقہ کے حساب سے، تین صاع کھجور صدقہ کر دو۔ ایک دوسری روایت، جو

عبداللہ بن معقل، کعب رضی اللہ عنہ کے واسطے سے، بیان کرتے ہیں، میں نے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ مذکورہ بالا آیت میری ہی بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فدیہ سرمنڈانے کے بعد واجب ہوتا ہے، یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اگر محرم کو قبل از وقت سرمنڈانا ہے تو اسے پہلے فدیہ دینا ہوگا۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ آن حضور نے انھیں سرمنڈانے کے حکم کے بعد فدیہ کا حکم دیا تھا۔ عبداللہ بن معقل بیان کرتے ہیں کہ کعب رضی اللہ عنہ مسجد میں تھے، میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے آپ سے مذکورہ بالا آیت کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے ہی متعلق نازل ہوئی تھی، میرے سر میں تکلیف تھی، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو جو نہیں میرے سر سے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آن حضور نے مجھے دیکھ کر فرمایا، میرا خیال یہ نہیں تھا کہ تمہیں اس درجہ تکلیف ہوگی، تمہارے پاس کوئی بکری بھی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو یہ آیت نازل ہوئی، اگرچہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی، لیکن اس کا حکم عام ہے۔ عبداللہ بن معقل ہی کی ایک آیت میں ہے کہ کعب نے فرمایا، حضور اکرم نے جب میری تکلیف دیکھی تو فرمایا کہ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ تمہیں اس درجہ تکلیف ہوگی، پھر آپ نے حجام کو بلا دیا۔ اس نے میرا سر منڈ دیا۔ پھر آپ نے دریافت فرمایا، تمہارے پاس قربانی کے لیے کوئی بکری ہوگی؟ میں نے عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا، پھر تین دن تک روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو، ہر مسکین نصف صاع کے حساب سے، کھانا کھلاؤ۔

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی روایت میں ہے کہ آن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنا سر منڈالو، اور تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ یا ایک بکری ذبح کرو۔ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی یہ روایت مختلف واسطوں سے منقول ہے۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت حدیبیہ میں درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے بھی احرام باندھ رکھا تھا۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی روایت کرنے والوں میں محمد بن کعب، ابو وائل شقیق بن سلمہ اور دوسرے حضرات ہیں۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بھی کعب رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روایت کی ہے۔

فدیہ کا مفہوم ہم بیان کر چکے ہیں کہ دربدلہ، جزاء، کے معنی میں ہے۔ صدقہ کی مقدار اور روزوں کی تعداد کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے، جو محرم پر قبل از وقت سرمنڈانے کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس صورت میں تین روزے یا تین صاع کا صدقہ چھ مسکینوں پر، فی مسکین نصف صاع کے حساب سے واجب ہوگا۔ اس سے پہلے جو روایتیں ہم نے بیان کی ہیں ان میں بعض روایتوں میں بصراحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صدقہ کی یہی مقدار اور روزوں کی اتنی ہی تعداد منقول ہے، اور یہ حضرات ان احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قول ابو مالک، عطاء، مجاہد، ابراہیم، سدی، ربیع سعید بن جبیر، علقمہ اور محمد بن کعب رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ کعب بن عجرہ اور علی بن ابی اللہ نے بھی فدیہ کی یہی مقدار بیان کی ہے۔ ان تمام حضرات سے اس مضمون کی روایتیں نقل ہیں کہ قبل از وقت سرمنڈانے

مراد ایک "صاع" اسی روپے کے سیر سے ساڑھے تین سیر کے مساوی ہے (مترجم)

پرایک بکری کی قربانی یا تین دن کے روزے یا چھ مسکینوں کو تین صاع غلے کی خیرات واجب ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کوئی محرم سر کی تکلیف میں سر منڈاتا ہے، دوا یا خوشبو کا استعمال کرتا یا کوئی بھی ایسا عمل کرتا ہے جو احرام کی حالت میں، جب کہ اسے کوئی بیماری یا تکلیف وغیرہ نہ ہو، کرنا جائز نہیں، تو اس پر دس دنوں کے روزے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے۔ یہ روایت حسن اور عکرہ رحمہما اللہ سے منقول ہے۔ ان حضرات نے اس مسئلہ کو قیاس کے ذریعہ حل کیا ہے۔ یعنی اگر کوئی محرم قربانی نہ کر سکے تو اس پر دس دن کے روزے فرض ہیں، گویا شریعت کی نظر میں ایک قربانی کا بدل دس دن کے روزے ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد مسکین کو کھانا کھلانے کا نمبر ہے، اگر کوئی شخص روزے نہ رکھ سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ نے ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلانا ضروری قرار دیا ہے، اس لیے دس روزوں کا بدلہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہو گا۔ قبل از وقت سر منڈانے کی صورت میں بھی ابتداءً ایک قربانی ہی واجب ہے، اور اسی لیے ان حضرات نے اس پر روزہ اور صدقہ کو قیاس کیا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قبل از وقت سر منڈانے والے محرم پر واجب ایک بکری کی قربانی ہی ہے، لیکن اگر بکری اسے میسر نہ ہو تو ایک بکری کی قیمت درہمیں (دکڑی) میں لگائی جائے، اور ان درہم کا جتنا غلہ ملتا ہوتا ہے ہی غلہ کا تحفہ کیا جائے۔ اور اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو پھر ہر آدھے صاع غلے کے بدلے میں ایک روزہ رکھے۔ سعید بن جبیر اور علقمہ رحمہما اللہ سے یہ روایت ہے، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں یہ قول نقل ہوا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان تینوں صورتوں کے درمیان اسے اختیار ہے جس طرح سے چاہے فدیہ دے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جتنی چیزیں بھی لفظ "أو" (یا) کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں ان میں اختیار دیا گیا ہے کہ مذکورہ امور میں جو چاہے اختیار کرے، اس کے خلاف جن چیزوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر فلاں نہ ملے تو پھر فلاں اختیار کرے، تو اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس کا سب سے پہلے بیان ہوا اسے ہی کرنا ہے، البتہ وہ اگر نہ ملے تو اس کے بعد بیان شدہ کو لینا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ زیر بحث قول عمرو بن دینار عکرہ، عطار اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔

ان تمام اقوال میں ہمارے نزدیک صحیح وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر ثابت ہے، کہ آپ نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو سر منڈانے کی اجازت دی اور ان سے فرمایا کہ اس قبل از وقت سر منڈانے کے بدلے میں وہ فدیہ دے، چاہے..... فدیہ بکری کی قربانی کی صورت میں ہو، یا تین دن کے روزے رکھ کر یا چھ مسکینوں کو تین صاع غلہ، ہر مسکین کو آدھا صاع کے حساب سے، صدقہ کر کے۔ فدیہ دینے والے کو اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جس کا چاہے فدیہ دے، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی ایک کا پابند نہیں کیا ہے، البتہ ان تینوں سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ فدیہ انھیں میں سے کسی ایک کا دینا ہو گا۔ قسم کے کفارہ دینے کی بھی صورت اسی طرح بیان ہوئی ہے اور اس صورت میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ کفارہ قسم میں بیان شدہ تین چیزوں میں سے کسی ایک کا کفارہ دینا ہو گا۔ صورت زیر بحث کو اس پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، کیونکہ دونوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فدیہ دینا ہو گا، اور اس کے بعد سر منڈانے کی اجازت ہے، ان کے سامنے بھی اس مسئلہ کی نظر میں اجماع امت کو رکھا جائے گا، امت کا اتفاق ہے کہ قسم کا کفارہ بعد میں ہوتا ہے۔ یہی صورت تمتع کے کفارہ میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان نظائر کو چھوڑ کر اس خاص مسئلہ میں یہ افراد بیت کس بنیاد پر پیدا کی جاسکتی ہے کہ اس کا فدیہ محرم پر سر منڈانے

سے پہلے ہی واجب ہو جائے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فدیہ میں اگر ایک بکری کی قربانی نہ کر سکا تو دس دن کے روزے رکھنے ہوں گے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ یہ قول صحیح حدیث کے خلاف ہے، اور اس لیے ناقابل قبول ہے۔ اس کے علاوہ ان کے قیاس کی بنیاد بھی غلط ہے۔

علماء کے اس بارے میں اقوال مختلف ہیں کہ فدیہ کی ادائیگی قربانی یا صدقہ کی صورت میں کہاں ہونی چاہیے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی مکہ معظمہ ہی میں انجام پا جانی چاہیے، کسی اور جگہ کرنے سے اس کی ادائیگی نہیں ہوگی، یہ قول حسن، طاؤس، عطاء اور مجاہد رحمہم اللہ سے نقل ہے، یعنی قربانی یا صدقہ کی صورت میں اگر فدیہ دینا ہے تو پھر وہ صرف مکہ ہی میں دینا ہوگا، مکہ کے سوا کسی اور جگہ ان کی ادائیگی حالت احرام میں قبل از وقت سرمنڈالینے کے فدیہ کے طور پر نہیں ہوگی۔ البتہ روزے کی صورت میں فدیہ کی ادائیگی کسی جگہ بھی کی جاسکتی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ بحالت احرام قبل از وقت کسی عذر کی وجہ سے سرمنڈالینے کی صورت میں جو فدیہ قربانی یا صدقہ یا روزے کی صورت میں واجب ہوگا، ان کی ادائیگی کے لیے، کسی مخصوص جگہ یا شہر کی قید نہیں، وہ کہیں بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ عبداللہ بن جعفر کے مولا ابواسامہ بیان کرتے ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ حج کے ارادہ سے نکلے، اور آپ کے ساتھ علی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ میں اپنے مولا ابن جعفر کے ساتھ تھا۔ بیان کیا کہ اچانک ہمیں ایک صاحب راستے میں سوتے ہوئے ملے اور ان کی اونٹنی ان کے سر کے پاس تھی۔ ہم نے آواز دی، اے سوتے والے! وہ جب بیدار ہوئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابن جعفر نے انھیں اٹھایا اور ہم انھیں مقام سقیہ پر لے کر آئے۔ پھر علی رضی اللہ عنہ کو بلا یا گیا اور ان کے ساتھ اسامہ بنت عمیس رضی اللہ عنہما بھی تھیں۔ بیان کیا کہ پھر ہم نے حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی تقریباً بیس دن تک تیمارداری کی۔ آخر علی رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ تم کس طرح کی تکلیف محسوس کرتے ہو، انھوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے آپ کا سر مونڈ دیا گیا، پھر آپ نے ایک اونٹ منگوا یا اور (اس قبل از وقت سرمنڈالنے کے فدیہ میں) اس کی قربانی کی (یعنی یہ قربانی کہ سے باہر ہوئی)۔ یہ روایت متعدد واسطوں سے منقول ہے۔ مجاہد اور ابراہیم رحمہما اللہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے کہ فدیہ جہاں سہولت ہو ادا کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ صرف قربانی مکہ میں کی جائے گی، باقی صدقہ اور روزے جہاں چاہے رکھ سکتا ہے۔ یہ قول علماء رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ میرے نزدیک راجح قول دوسرا ہے، یعنی فدیہ، خواہ وہ کسی صورت میں ادا کیا جائے، کی ادائیگی میں کسی بھی خاص شہر یا مقام کی قید نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود کسی شہر یا مقام کی قید نہیں لگائی، بلکہ فدیہ کے حکم کو عموم کے ساتھ بیان کیا ہے، اس لیے ہمیں بھی عام ہی رکھنا ہوگا اور فدیہ دینے والا جہاں بھی قربانی کرے یا صدقہ کرے یا روزے رکھے، اس کا فدیہ ادا ہو جائے گا۔

اس موقع پر ایک اور مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ فدیہ اگر قربانی کی صورت میں دیا گیا ہے تو فدیہ دینے والا خود بھی اس قربانی کے گوشت کو کھا سکتا ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ فدیہ دینے والا فدیہ کی قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام گوشت کا صدقہ کر دے۔ عطاء اور مجاہد رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے، آپ حضرات سے یہ نقل ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کر لینے کا بدلہ قربانی کی صورت میں، فدیہ کی قربانی اور مسکینوں

کے لیے کی ہوئی نذر کا کھانا جائز نہیں، بلکہ انھیں صدقہ کر دینا ہوگا، البتہ نقلی قربانی یا تمتع کی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے۔
 دوسرا قول یہ ہے کہ فدیہ کی قربانی کا گوشت کھانا جائز ہے۔ یہ قول ابن عمر رضی اللہ عنہ، ابن ابی لیلیٰ حماد اور حسن رحمہم سے نقل ہے جن حضرات نے فدیہ کا گوشت فدیہ دینے والے کے لیے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فدیہ خود اس کے لیے ہوتا تو اس کا کوئی مفہوم نہیں باقی رہ جاتا کہ اسی پر اس کی ادائیگی واجب ہے، کیونکہ کسی زبان میں یہ محاورہ آپ نہیں بتا سکتے کہ ”فلاں شخص پر خود اسی کا قرض چلا ہے“ اس لیے لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ جو فدیہ اس پر واجب ہے وہ اس لیے واجب ہے تاکہ وہ دوسروں پر اسے خرچ کرے، خود اس کے لیے اس میں سے کھانا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ فدیہ کی قربانی کا گوشت خود فدیہ دینے والے کے لیے جائز ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی اس قربانی کے حکم میں ہے جو عید الاضحیٰ میں کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کا تمام گوشت مسکینوں کو دے دینے کا حکم نہیں دیا ہے، اس لیے جب کوئی شخص مذکورہ بالا صورت میں کسی جانور کو ذبح کرتا ہے تو وہ اللہ کا حکم بجا لاتا ہے، اور اب اسے اس میں سے کھانے کی بھی اجازت ہے اور حسب منشاء صدقہ کرنے کی بھی اجازت ہے، یعنی اگر ادائیگی صدقہ یا روزے کے بجائے قربانی کی صورت میں ہو رہی ہے تو فدیہ اس پر صرف جانور کو ذبح کرنے کا واجب ہے اور ذبح کے بعد فدیہ ادا ہو جاتا ہے، اس پر ذبح کیے ہوئے جانور کے گوشت کا صدقہ بھی واجب نہیں ہے لیکن اس صورت میں اگر وہ اس قربانی کا تمام گوشت خود استعمال کر لیتا ہے اور اس میں سے ایک بوٹی بھی صدقہ نہیں کرتا تو اس میں کوئی حرج نہ ہونا چاہیے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی اہل علم اس کا قائل نہیں۔ اب دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ اس میں سے کچھ صدقہ کرنا بھی اس پر واجب ہے، اس صورت میں جس طرح اپنے مال کی زکات کوئی شخص خود نہیں کھا سکتا، اس فدیہ کی قربانی کا گوشت بھی کھانا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا۔ امت کا یہ اجماع اس قول کی تائید کے لیے واضح دلیل ہے کہ خود فدیہ دینے والے کے لیے فدیہ کا گوشت کھانا جائز نہیں۔

”نساک“ کا م عرب میں اللہ کے لیے ذبح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ ”نساک“ سے مراد بکری کا ذبح کرنا ہے۔

”فَإِذَا أَمِنْتُمْ“ کی تفسیر بعض مفسرین نے کی ہے کہ ”پھر جب تم اس مرض سے شفا پا جاؤ جس نے تمہیں حج اور عمرہ سے روک دیا تھا“ علقمہ اور عروہ رحمہما اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”جب تمہیں خوف سے امن ہو جائے“، قتادہ اور ربیع سے یہ تفسیر نقل ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”اگر خوف ہے تو اس سے امن ہو جائے، مرض ہے تو اس سے شفا ہو جائے“ یہ قول زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ ”امن“ دھس سے امنتہ ماخوذ ہے (خوف کے مقابل اور ضد میں استعمال ہوتا ہے) یہ مرض کے مقابل نہیں ہے۔ البتہ اگر مرض ایسا ہے کہ اس میں جان کا بھی خطرہ ہے، پھر اس کے مقابل میں بھی اس کا استعمال ہو سکتا ہے، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ ”پھر جب تم مرض کی شدت اور خوف میں ہلاکت سے امن میں ہو جاؤ“، لیکن یہ مفہوم پیدا کرنا دور کی کوڑی لانا ہے۔ دشمن کے خوف سے امن اور حالت اطمینان میں ہو جانے کی بھی زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ آیات صلح حدیبیہ کے موقع پر دشمن سے خوف ہی کی حالت

میں نازل ہوئی تھیں۔

”فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْحُمْرَةِ إِلَى الْوَسْطِ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ“ یعنی اے مسلمانو! جب تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی کا جانور بھی میسر ہو لے پیش کر دو۔ پھر جب تم حالتِ اطمینان میں ہو جاؤ اور تمہارا دشمن کا خوف یا مرض میں ہلاکت ہو جانے کا خوف جاتا رہے اور حج کے ساتھ عمرہ سے بھی مستفید ہونا چاہو تو تم پر لازم ہے کہ جو قربانی تمہیں میسر ہو اسے کر ڈالو۔

اس آیت میں تمتع حج کے ساتھ عمرہ سے بھی مستفید ہونے کی کون سی صورت بیان ہوئی ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ کسی نے حج کا احرام باندھا تھا، لیکن درمیان میں اسے دشمن کے خوف، مرض یا کسی بھی معقول وجہ سے رک جانا پڑا اور اس کا حج چھوٹ گیا، تو رکاوٹ دور ہونے کے بعد اسے مکہ معظمہ حاضر ہونا چاہیے اور حج کے بجائے صرف شہ کر کے اپنا احرام کھول دینا چاہیے۔ اب وہ محرم نہیں رہا، لیکن پھر آئندہ سال اسے حج کرنا چاہیے اور قربانی کرنی چاہیے، کیونکہ سال اول میں اپنے پہلے احرام سے دوسرے سال کے دوسرے احرام تک اسے حلال اور احرام سے آزاد رہنے کا فائدہ حاصل ہوا ہے،... سال اول میں اس نے عمرہ کیا تھا اور دوسرے سال حج ادا کیا۔ یہ قول ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر تمہیں احرام کے بعد حج سے رک جانا پڑے تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو اسے پیش کر دو، اب تم حلال ہو، احرام کھولنے کے لیے تم نے صرف قربانی ذبح کر دینی کافی سمجھی، اس کے لیے عمرہ نہیں کیا، بلکہ عمرہ کو دوسرے سال حج کے ساتھ ادا کرنے کے لیے رکھ چھوڑا۔ اس لیے جب تمہیں خوف یا مرض سے چھٹکارا ملے تو ایام حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھو اور افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد یہ احرام کھول دو، پھر جب حج کے دن آئیں تو حج کا احرام باندھو، تو عمرہ اور حج کے درمیان میں احرام کھول کر تم جو مستفید ہو گے اس کی وجہ سے تم پر واجب ہے کہ جو قربانی کا جانور تمہیں میسر ہو اس کی قربانی کرو۔ یہ قول ابراہیم علقمہ سے نقل کرتے ہیں، آپ نے بیان کیا کہ علقمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول جب میں نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔ علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول روایت ہے، قتادہ اور ابراہیم کا بھی یہی خیال تھا۔ اس قول کی بنیاد پر حج سے کسی مجبوری کی وجہ سے رک جانے والا قربانی کے جانور کے اپنے مقام پر ذبح ہو جانے ہی سے حلال ہو جاتا ہے، لیکن خوف یا مرض کے ختم ہو جانے کے بعد وہ شخص بیت اللہ پہنچ کر عمرہ ادا کرتا ہے تو اس پر دوسرے سال صرف حج واجب ہوگا، اور اگر بیت اللہ نہیں جاتا، بلکہ اس کے بجائے گھر واپس چلا آتا ہے تو آئندہ سال اس پر حج کے ساتھ عمرہ بھی واجب ہوگا اور اس لیے قربانی بھی کرنی ہوگی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت صرف محصر یعنی ایسے شخص ہی کے بارے میں نہیں ہے جسے احرام باندھنے کے بعد کسی عذر شرعی کی بنا پر حج سے رک جانا پڑا، بلکہ اس میں عام حکم بیان ہوا ہے اور محصر اور غیر محصر سب کے لیے ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بجائے یہ قول نقل ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا حکم ہے جنہوں نے پہلے تو صرف حج کا احرام باندھا تھا، لیکن پھر اسے فسخ کر کے عمرہ کا احرام باندھ لیا، اور افعال عمرہ ادا کرنے کے بعد ایام حج تک حلال رہے، اور جب حج کے دن آئے تو حج کا احرام باندھا۔ ایسے شخص پر تمتع کی قربانی واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ حج کے ارادہ سے نکلے تھے۔ جب مکہ معظمہ پہنچے تو ان حضوروں نے فرمایا کہ جو کوئی (عمرہ کے افعال کی ادائیگی کے بعد) حلال ہونا چاہے وہ حلال ہو جائے۔ صحابہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ تو حلال نہیں ہو رہے ہیں؟ آنحضرت

نے فرمایا کہ میں اپنے ساتھ قربانی کا جانور لایا ہوں اس لیے میں حج قرآن کرؤنگا۔ ایک اور قول یہ ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا حکم بیان کیا گیا ہے جو ایام حج میں مکہ معظمہ کے سوا کسی دوسرے شہر سے عمرہ کا احرام باندھ کر آئیں، کہ افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد انھیں حلال ہو کر مکہ معظمہ ہی میں ٹھہر جانا ہے۔ پھر حج کی ادائیگی کے دن آئیں تو حج کا احرام باندھ کر حج ادا کرنا ہے، یہی عمرہ کے احرام سے حلال ہو کر حج کے احرام تک اس سے مستفید ہونا ہے اور اس پر حسب استطاعت قربانی واجب ہے۔ یہ قول ابن عمر رضی اللہ عنہ، مجاہد، عطاء، ابن ابی سعید بن مسیب رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ عطاء سے ایک روایت میں ہے کہ تمتع اللہ کی تمام مخلوق کے لیے جائز ہے، آزاد، غلام، مرد، عورت، ہر انسان کے لیے ایام حج میں عمرہ کرنے کے بعد مکہ معظمہ ہی میں قیام کی اجازت ہے، تاکہ حج کے دن آئیں تو حج کا احرام باندھ کر حج کی بھی ادائیگی کرے۔ اسے ”تمتع“ اس لیے کہتے ہیں کہ عمرہ اس میں حج کے ہینوں ہی میں کیا جاتا ہے، اور پھر عمرہ سے فراغت کے بعد حج کے احرام تک انسان احرام سے آزاد رہنے کا فائدہ (تمتع) حاصل کرتا ہے۔

میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ آیت میں محصر حج سے روک دینے والے (بی حکم بیان ہوا ہے، یعنی جب تم حالت اطمینان میں ہو جاؤ تو جو شخص ”احصار“ کی وجہ سے حج چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا، اگر وہ پچھلے سال حج کے چھوٹ جانے کی وجہ سے آٹھ سال حج کے ساتھ عمرہ سے بھی مستفید ہو، یعنی حج کے ہینوں میں حج کے احرام سے پہلے عمرہ کا احرام باندھے، اور پھر اس کی ادائیگی کے بعد حج کے احرام تک حلال ہونے کا فائدہ اٹھائے تو اس پر لازم ہے کہ جو قربانی کا جانور میسر ہوا سے پیش کرے۔ اس قول کے راجح ہونے کی وجہ ہے کہ ذکر آیت میں محصر ہی کا ہور ہا ہے۔

”فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامٌ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ“ بیان یہ ہور ہا تھا کہ حج تمتع میں جو بھی قربانی میسر ہو وہ پیش کرنی ہوگی۔ اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ ”لیکن اگر کسی کو قربانی کا جانور میسر ہی نہ آئے تو وہ تین روزے زمانہ حج میں رکھے، اور سات روزے اپنے گھر واپس ہو کر“ بعض حضرات کہتے ہیں کہ زمانہ حج کے یہ تین روزے عرفہ میں قیام کے دن تک کسی بھی وقت رکھے جاسکتے ہیں، صرف یہ ضروری ہے کہ آخری روزہ عرفہ کے دن تک پورا ہو جائے۔ چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پہلا روزہ یوم ترویہ (ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ) سے ایک دن پہلے رکھ لے، دوسرا یوم ترویہ میں اور تیسرا عرفہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ) میں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حج تمتع کرنے والا عمرہ کے احرام کے بعد عرفہ کے دن تک کسی بھی دنوں میں روزے رکھ سکتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی، علی رضی اللہ عنہ سے منقول روایت کے مطابق قول نقل ہوا ہے۔ مذکورہ بالا قول عروہ، حسن، حکم، ابراہیم، سعید بن جبیر، عطاء، مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عامر، سدی، ربیع، طاؤس اور ابو جعفر سے نقل ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ روزے رکھنا تو چاہئے عرفہ کے دن تک ہی، لیکن اگر چھوٹ جائے تو پھر اسے ایام منیٰ (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ) میں قضا کرے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایام منیٰ کی آخری تاریخ تک یہ تین روزے رکھے جاسکتے۔ علی رضی اللہ عنہ کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے، آپ نے فرمایا کہ حج کے دنوں میں اگر کوئی شخص روزے نہ رکھ سکے تو ایام تشریق (ایام منیٰ) میں رکھ لے۔ یہ قول عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عمر اور زبیر رضی اللہ عنہم سے بھی نقل ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن تک یہ روزے پورے کر لینے چاہئیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ قربانی کا جانور میسر نہ آنے کی صورت میں "تین روزے حج میں رکھے، اور حج عرفہ کے دن ختم ہو جاتا ہے" اس کے بعد حج کا احرام باندھنے والا دسویں تاریخ کو قربانی کے دن احرام کھول دیتا ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ قربانی کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اگر یہ اجماع کہ قربانی کے دن روزہ رکھنا جائز نہیں اس وجہ سے ہے کہ وہ ایام حج ہی میں سے نہیں ہے تو باقی ایام تشریق میں روزے رکھنا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں ان کا ایام حج میں سے نہ ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ اور اگر اس اجماع کی وجہ یہ ہے کہ قربانی کا دن (دس ذی الحجہ) عید کا دن ہے تو اس کے بعد کے دو دن بھی عید ہی کے دن ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں میں روزے رکھنے سے بھی اسی طرح منع فرمایا ہے جس طرح قربانی کے دن کے روزے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے اگر عرفہ کے دن تک روزے پورے نہیں ہوتے تو ان کے رکھنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے، روزے چھوٹ جانے کی وجہ سے اسے قربانی ہی کرنی پڑے گی، جو اللہ تعالیٰ نے اس پر پہلے ہی "تمتع" کی وجہ سے فرض کی تھی۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ حج تمتع میں اگر کوئی شخص قربانی نہ کر سکا تو اس کے بدلے میں جو تین روزے اسے زمانہ حج میں رکھنے ہوں گے وہ ایام تشریق تک رکھے جاسکتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ حج کرنے والے پر اللہ تعالیٰ نے اتوار قربانی واجب کی ہے، اور قربانی میسر نہ آنے کی صورت میں روزے واجب ہیں۔ اگر اسے قربانی کا جانور میسر ہوتا تو اس کی قربانی، قربانی کے دن یعنی دسویں تاریخ ہی کو کرتا، اس لیے روزے کی بھی اجازت اسی دن ہوگی جو قربانی کا دن ہے، کہ جب اصل اسے واقعی نہ میسر آسکی تو اس کا بدلہ دوسری صورت یعنی روزے رکھ کر دیدے۔ قربانی دسویں تاریخ اور اس کے بعد دو دن تک کی جاتی ہے، اس سے پہلے قربانی صحیح ہی نہیں ہوگی، اس لیے روزے رکھنے کا فیصلہ بھی اسی دن ہوگا جو قربانی کا دن ہے، کہ اگر واقعی اس دن بھی وہ مجبور ہے اور قربانی کے جانور کا انتظام نہیں کر سکتا تو اس کے بجائے تین روزے رکھے۔ قربانی دسویں تاریخ کی طلوع فجر کے بعد واجب ہوتی ہے، اب اگر اس وقت تک اسے قربانی کا جانور میسر نہیں تو روزے شروع کر دے، اور چونکہ تین دن کے روزے ہیں، اس لیے ایام تشریق کے آخر تک رکھے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ کہ ایام تشریق حج کے زمانہ سے خارج ہیں غلط ہے، کیونکہ ان دنوں میں بھی بہت سے اعمال حج، مثلاً قربانی، رمی وغیرہ، کیے جاتے ہیں۔ اپنی تائید میں احادیث بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کرنے والے کو جسے قربانی کا جانور میسر نہ آسکا ہو اور جو ذی الحجہ کی دس تاریخ تک روزے بھی نہ رکھ سکا ہو اس کی اجازت دی تھی کہ اس کے بدلے میں ایام تشریق میں روزے رکھ لے۔ زہری سے ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن حذافہ بن قیس رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور انہوں نے آل حضور کے حکم سے ایام تشریق میں یہ اعلان کیا کہ یہ دن کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں، سوا اس شخص کے جس پر قربانی کے بدلے کے روزے باقی رہ گئے ہوں۔

ان تین روزوں کے بارے میں، جو تمتع کی قربانی نہ میسر آنے کی صورت میں واجب ہیں، علماء کے اقوال مختلف ہیں کہ کس وقت ان کی ابتداء واجب ہو جاتی ہے اور کس وقت جائز ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حج کے مہینوں کی ابتداء میں ہی رکھ لینے چاہئیں۔ مجاہد اور طاؤس رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ حج کے مہینوں میں جب بھی یہ روزے

رکھ لینے کافی ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بہتر تو یہی ہے کہ ذی الحجہ میں اس کی دس تاریخ تک روزے پورے کر لے، لیکن اگر شوال یا ذی قعدہ میں بھی روزے رکھنا ہے تو ادا ہو جاتے ہیں۔ آپ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر کوئی تمتع شوال میں ایک روزہ، دوسرا روزہ ذی قعدہ میں اور تیسرا روزہ ذی الحجہ میں رکھنا ہے تو ادا ہو جاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ روزے صرف ذی الحجہ کی ابتدائی نو تاریخوں میں ہی رکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے سوا دوسرے دنوں میں نہیں رکھے جاسکتے۔ عطاء بن ابی رباح اور ابو جعفر سے یہ قول نقل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ حج کے احرام سے بھی پہلے یہ روزے رکھے جاسکتے ہیں۔ یہ قول عکرمہ اور عطاء سے روایت ہے اس کے بالمقابل یہ قول ہے کہ احرام سے پہلے جائز نہیں، حج کے احرام کے بعد ہی ان کی اجازت ہے۔ یہ قول ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ذی قعدہ میں رکھ لے تو جائز ہے۔

میری رائے میں راجح قول یہ ہے کہ تمتع قربانی کا جانور نہ بیسرا آنے کی صورت میں جو تین دن کے روزے زمانہ حج میں رکھے گا، وہ عمرہ کے بعد حج کا جب احرام باندھے گا تو ان روزوں کی ابتداء اسی وقت سے جائز ہے، اور حج کے آخری عمل کے ختم ہونے تک ان روزوں کے رکھنے کی آخری حد ہے، اس میں ایام منیٰ بھی آجاتے ہیں، البتہ قربانی کے دن (ذی الحجہ کو) روزہ نہ رکھے، کیونکہ اس دن کا روزہ جائز نہیں۔ حج کے احرام سے پہلے یہ روزے اس لئے جائز نہیں کہ جب تک حج کا احرام نہ باندھے گا اس وقت تک اس کا تعین نہیں ہو سکتا کہ وہ حج تمتع کرے گا بھی یا نہیں صرف نیت کا ہونا کافی نہیں ہو سکتا، عملاً بھی جب احرام حج باندھے گا پھر اس کا تمتع ہونا متعین ہو جائے گا اور اس وقت اگر اسے قربانی کا جانور بیسرا نہیں ہے تو پھر روزے رکھنا چاہیے۔

”وَسَبَّحْتَ رَاذًا رَجَعْتُمْ“ اس سے پہلے یہ معنون تھا کہ حج تمتع کرنے والے کو اگر قربانی کا جانور بیسرا نہ ہو تو تین روزے زمانہ حج میں رکھے، اس کے بعد ارشاد ہے کہ ”اور سات روزے اس وقت رکھے جب اپنے گھر واپس آجائے“ گھر واپس آنے سے پہلے بھی یہ سات روزے رکھ سکتا ہے، لیکن گھر واپس آکر رکھنے کی تصریح رخصت اور بندوں پر رحمت و رافت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ مسافر اور مریض کو رمضان میں روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے، کہ جب سفر ختم ہو جائے یا صحت حاصل ہو جائے تو چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کر لے، وہی صورت یہاں بھی ہے۔ اگر تمتع مذکورہ صورت میں کوئی بار نہیں محسوس کرتا اور آسانی سے سفر حج یا مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ہی میں یہ سات روزے بھی رکھ سکتا ہے تو اسے ان روزوں کے رکھ لینے کی بھی اجازت ہے اور یہ ادا ہو جائے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ رخصت ہے، اگر چاہے تو راستے میں بھی رکھ سکتا ہے اور اگر چاہے تو گھر واپس آکر رکھ لے۔ یہ قول منصور، عطاء اور ابراہیم رحمہم اللہ سے بھی نقل ہے۔ عطاء نے فرمایا کہ میرے نزدیک پسندیدہ یہی ہے کہ گھر واپس آکر ہی رکھے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرتا ہے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آیت کے اس نکتے سے مراد ”گھر اور اپنے شہر واپس آنا ہے“، کیوں نہیں اس سے مراد منیٰ سے مکہ معظمہ کی واپسی لی جائے؟ تو یہ اعتراض صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ تمام اہل علم کا اسی مفہوم پر اتفاق ہے جو ہم نے بیان کیا۔ عطاء، قتادہ، ربیع اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے۔

”تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ“ میں ”کاملۃ“ کے مفہوم کے سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ تین دن کے روزے زمانہ حج میں اور سات دن کے گھر والی کے بعد پورے دس ہیں جو تمتع کی قربانی کا مکمل بدل ہیں۔ یہ قول حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”تمہیں پورا اس شخص جتنا ثواب ملے گا جو اپنے احرام کو حج کے اعمال کی ادائیگی سے پہلے نہ کھولتا اور تمہاری طرح عمرہ کے اعمال کی انجام دہی کے بعد حج تک احرام کھول کر مستفید نہ ہوتا۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت میں لفظ ”کاملۃ“ محض کلام کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد امر و حکم ہے، یعنی ”کاملۃ“، ”اکملوا“ کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہوگا کہ دس روزے جو تم پر فرض ہیں وہ پورے کرو، اور اس میں کوتاہی سے کام نہ لو۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ”کاملۃ“ کا دس کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی کافی ہیں۔

میرے نزدیک راجح تفسیر یہ ہے کہ ”تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ“ یعنی ہم نے تم پر ان کا پورا کرنا فرض کیا ہے یہ روزے اس قربانی کا بدل ہیں جو تمتع پر واجب تھی۔ دو مرحلوں میں ان روزوں کی تفصیل بتانے کے بعد ارشاد ہے کہ یہ دس دن کے روزے ہیں اور تم پر فرض ہے کہ تم ان سب کو رکھو۔ بظاہر تو ترکیب ”خبر“ کی ہے، لیکن معنی میں امر اور حکم ہی کے ہے۔

”ذَلِكَ لِیَمُنْ لَدَیْكَ اَهْلُهَا سَخِیْرَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ یہ اس کے لیے جس کے اہل مسجد حرام کے قریب نہ رہتے ہوں۔ یعنی حج تمتع جس کا بیان اوپر ہوا ان افراد کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے قریب رہتے ہوں، حج تمتع کرنا اہل مکہ کے لیے درست نہیں، بلکہ صرف وہ لوگ یہ حج کر سکتے ہیں جو مکہ معظمہ کے سوا دوسرے شہروں اور ملکوں سے حج کے لیے آئیں۔ یہ قول ربیع اور سدّی رحمہما اللہ سے روایت ہے۔ سدّی نے فرمایا کہ حج اور عمرہ ایک ہی ساتھ، بیچ میں تمتع کے ساتھ، اس لیے جائز ہوا تاکہ دور سے آنے والوں کے لیے آسانی رہے اور وہ ایک ہی سفر میں دونوں انجام دے سکیں۔

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ آیت میں ”جس کے اہل مسجد حرام کے قریب نہ رہتے ہوں“ سے مراد حدود حرم کے تمام باشندے ہیں، لیکن اس کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ اس میں شامل ہیں یا نہیں؟ اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، یحییٰ بن سعید انصاری اور طاؤس رحمہم اللہ سے یہ رائے نقل ہے کہ اس سے مراد صرف اہل حرم ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل حرم کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو حدود میقات کے اندر

دعاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ، لہ فقہاء احناف اور بعض اکابر تابعین سے یہ مفہوم نقل ہے کہ ”اذا رجعتہ“ سے مراد اعمال حج سے فراغت ہے، یعنی باقی سات روزے اعمال حج سے فارغ ہو کر رکھ لے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی قول نقل ہے، ابن جبار نے البحر المحیط میں عطار اور ابراہیم رحمہما اللہ سے بھی یہ قول نقل کیا ہے (مدت ترجمہ)۔
دو متعلقہ صفحہ (۱) معہ ”میقات“ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں پہنچ کر ہر حاجی پر حج یا عمرہ کی نیت اور احرام باندھ لینا واجب ہے۔ ہر سمت سے آنے والوں کے لیے میقات الگ الگ اس سمت کے مطابق ہے۔

آباد ہیں۔ یہ قول کھول اور عطار سے روایت ہے۔
تیسرا قول یہ ہے کہ اہل حرم اور جن کے مکانات حرم سے متصل ہوں مراد ہیں۔ عطار زہری اور ابن زبیر سے یہ قول منقول ہے۔ عطار کی روایت میں ہے کہ حرم سے متصل علاقوں، عرفہ، رجیع اور ضحان وغیرہ کی آبادی بھی اہل حرم ہی کے حکم میں ہیں۔ امام زہری کی روایت میں ہے کہ حرم سے ایک دو دن کی مسافت پر دائرہ و غیرہ کی متوسط رفتار کے مطابق جن کی آبادیاں ہوں وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔

میرے نزدیک صحت سے قریب قول یہ ہے کہ مراد وہ تمام آبادیاں ہیں جو مسجد حرام کے چاروں طرف اتنی مسافت پر ہیں جہاں سے مسجد حرام تک سفر میں نماز کے قصر کا حکم نہیں ہے۔ ”حَاضِرٌ“ جو آیت میں استعمال ہوا ہے اس کا مفہوم کلام عرب میں ”موجود و شاہد“ ہے۔ ”حَاضِرٌ الشَّيْءُ“ یعنی جو اس چیز کے پاس خود موجود ہو، اس لیے جس شخص پر کہ معظم میں مسافر کا حکم لاگو ہوتا ہو وہ اس میں ”حَاضِرٌ“ نہیں کہلا سکتا، اس کے برعکس جو اپنے گھر سے مکہ معظمہ پہنچ کر بھی شرعی مسافر نہیں ہوتا وہ ”غائب“ نہیں کہلا سکتا، وہ بھی مسجد حرام کے ”حاضرین“ میں شامل ہے۔
”وَ اتَّقُوا اللَّهَ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ“ یعنی اللہ سے اس کے فرائض و حدود میں طاعت کے ذریعے ڈرتے رہو، اور مناسک حج کے سلسلے میں اس کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کرنے سے پرہیز کرو، جو تم پر اس سلسلے میں حرام ہیں انہیں حلال ہرگز نہ کرو، اور جان لو کہ اللہ کا عذاب ان لوگوں پر بہت سخت ہے جو اس کی حرمتوں کو توڑتے ہیں اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۖ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا

(زمانہ حج چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں دشوال، ذیقعدہ اور دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے تو پھر (اس کو)

رَفَتْ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ

نہ کوئی بخش بات (جائز ہے) اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے اور نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے۔ اور جو نیک کام کرو گے

خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللَّهُ ۗ وَ تَزُودُ وَافِيَانَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۗ وَ

خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے۔ (جب حج کو جانے لگو) خرچ ضرور لے لیا کرو کیونکہ سب سے بڑی بات خرچ میں (گدگاری)

وَ اتَّقُونَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۗ

سے بچا رہنا ہے اور اے ذی عقل بوگو مجھ سے ڈرتے رہو۔

احرام حج کے بعد
”الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ“ یعنی حج کے مہینے معلوم ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حج کے ان معلوم مہینوں سے مراد دشوال اور ذی قعدہ تکمیل اور ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتوں میں یہ قول نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین معلوم مہینوں کو

حج کے لیے رکھا ہے، سال کے باقی مہینے عمرہ کے ہیں۔ یہ قول سفیان، ابراہیم، شعبی، عامر، سدی، مجاہد، ضحاک اور عطار رحمہم اللہ کا ہے، اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ شوال اور ذی قعدہ کی طرح ذی الحجہ کا بھی پورا مہینہ حج کا مہینہ ہے۔ اس کی روایت بواسطہ نافع و مجاہد، ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، اور عطار، ربیع، قتادہ، ابن طاؤس اور ابن شہاب رحمہم اللہ سے ہے۔ اس قول سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دس ذی الحجہ کے بعد حج کا کوئی عمل باقی رہ جاتا ہے، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ شوال اور ذیقعدہ کی طرح ذی الحجہ کا بھی پورا مہینہ حج ہی کا مہینہ ہے، اور تین مکمل مہینوں کو چھوڑ کر سال کے بقیہ مہینے عمرہ کے مہینے ہیں۔ چنانچہ نافع روایت کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (أَتَمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ كِي تَشْرِيحَ فِيهِ) اگر حج کے مہینوں سے عمرہ کو الگ اور عمرہ حج کے مہینوں کے سوا سال کے دوسرے مہینوں میں کرو تو تم اپنے حج کو بھی پورا کر لو گے اور عمرہ کو بھی پورا کرنے والے ہو گے۔

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم میں سے ایک غور حج کر چکی ہے، یا حج کا ارادہ رکھتی ہے، تو کیا وہ حج کے ساتھ عمرہ بھی کر سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ یہ صرف حج ہی کے مہینے ہیں۔ قاسم بن محمد نے فرمایا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کی کیا ادائیگی نہیں ہوتی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ حرم کے مہینے ہیں؟ فرمایا کہ اس میں اگر کیا جائے تو مکمل ہوتا ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا کہ عمرہ حرم کے مہینے میں مستحب ہے، کیونکہ یہ حج کا مہینہ نہیں ہے، فرمایا کہ عمرہ کو حج کے مہینوں میں بزرگوں نے مکمل نہیں خیال کیا۔

ابو یعقوب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ ذی الحجہ کی ابتدائی دس تاریخ تک عمرہ کرنے سے میرے نزدیک یہ زیادہ بہتر ہے کہ ان دس ابتدائی دنوں کے بعد آخر کے بیس دنوں میں کیا جائے۔

اس باب میں عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد صحیح بخاری میں بھی دوسرے الفاظ کے ساتھ موجود ہے (وَأَتَمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ) کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمیں کتاب اللہ پر عمل کرنا چاہیے، کہ اس میں کہاں کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تشریح میں خود علماء کی رائے متحد نہیں ہے۔ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس ارشاد سے اس عمل سے روکا ہے کہ کوئی شخص پہلے حج کا احرام باندھے اور پھر اسے فسخ کر کے، حج تمتع کی نیت سے، عمرہ کا احرام باندھے، آپ نے فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے۔ اس توضیح کی روشنی میں ابن جریر کے پیش کردہ زیر بحث قول کے اکثر دلائل و اقوال کا شمار ہی دوسرا ہو جاتا ہے، اور اس سے وہ مفہوم اخذ نہیں کیا جاسکتا جو زیر بحث قول کے قائل حضرات نے اخذ کیا ہے۔ لیکن علماء کی ایک جماعت، جس میں امام نووی بھی شامل ہیں، یہ کہتی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حج قرآن اور حج تمتع سے منع کیا ہے۔ اس تشریح کی بنیاد پر زیر بحث قول کے دلائل کے طور پر عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات کے اقوال پیش کرنا صحیح ہوگا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا یہ مفہوم ہی نہیں۔ اصل میں عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر ایک الگ نقطہ نظر سے غور کر رہے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ بیت اللہ سال کے کسی حصہ میں خالی نہ رہے، لوگوں کا ہمیشہ اور ہر وقت اللہ کے اس پاک گھر کی طرف رجوع پورے ذوق و شوق کے ساتھ باقی رہے۔ قرآن و تمتع میں آدمی حج و عمرہ ایک ہی سفر میں کر لیتا ہے۔ لیکن اگر لوگ حج افراد کرنے لگیں، اور حج کے مہینوں میں صرف حج ہی کی ادائیگی تک محدود رہیں، تو پھر صاحب استطاعت رہا کرتے ہیں۔

محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمام اہل علم کے نزدیک یہ مسئلہ شبہ سے بالاتر ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے سے ان مہینوں کے سوا سال کے دوسرے مہینوں میں عمرہ کرنا افضل ہے۔ اس کی نظائر بہت ہیں، اور اگر سب کو بیان کیا جائے لگے تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج کے مکمل تین مہینے ہیں۔ اگر حج ان کے بعض مخصوص دنوں ہی میں انجام دیا جاسکتا ہے، لیکن بہر حال وہ سب اس معنی میں حج کے مہینے کہلاتے ہیں کہ ان میں عمرہ کرنا مستحسن نہیں۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ حج کے مہینے شوال اور ذی قعدہ کے علاوہ ذی الحجہ کے صرف ابتدائی دس دن ہیں، انکا نقطہ نظر یہ ہے کہ آیت ”الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّخْلُوعَاتٌ“ میں صرف حج کا وقت بتایا گیا ہے، عمرہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، اور نہ اس آیت کے ضمن میں زیر بحث لانے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ عمرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ احادیث میں موجود ہے کہ خود حضور اکرم نے عمرہ حج کے بعض مہینوں میں ادا کیا (عمرہ حدیبیہ کی ادائیگی بھی ذی قعدہ میں کی)۔ اس کے بعد آپ سے کبھی اس کے خلاف نہیں سنا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمرہ سال کے کسی بھی حصے میں کیا جاسکتا ہے۔ اور چونکہ حج دس ذی الحجہ کو ختم ہوجاتا ہے، اس لیے آیت زیر تفسیر میں بھی ”حج کے مہینوں“ سے دو مکمل اور تیسرے مہینے، یعنی ذی الحجہ کا بعض حصہ مراد ہوگا۔ ہمارے نزدیک بھی یہی قول صحیح ہے۔ آیت میں حج کا وقت بیان کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ ایام نئی کے بعد حج کا کوئی عمل باقی نہیں رہتا، اس لیے تیسرے مہینے، یعنی ذی الحجہ کے تمام دن کس طرح مراد لیے جاسکتے ہیں! پس صحیح قول یہی ہو سکتا ہے کہ ذی الحجہ کے صرف ابتدائی دس دن ”حج کے معلوم مہینوں“ میں داخل ہیں۔ کلام عرب میں جمع کا صیغہ (جیسا کہ آیت میں ”اشہر“ استعمال ہوا ہے) اس وقت بھی عام طور سے استعمال کرتے ہیں جبکہ دو مکمل اور تیسرے کا صرف بعض حصہ مراد ہو، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ مکمل تین سے کم اگر مہینے مراد لیے جائیں تو وہ اشہر جمع کے ساتھ صحیح نہیں ہوگا۔ اسی طرح تثنیہ (دو کے لیے) کے صیغہ کا ایک مکمل، دوسرے کے بعض حصے کے ساتھ، پر بھی اطلاق کرتے ہیں، مثلاً ”ذی طرہ یا سوادن کے لیے“ ”یَوْمَانِ“ (تثنیہ، دو دن) کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید میں خود آیا ہے ”وَمَنْ تَجَلَّ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا تَأْتُمَّ عَلَيْهِ“ (جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے اس پر کوئی گناہ نہیں)، حالانکہ مراد ایک مکمل دن کے ساتھ دوسرے دن کا صرف آدھا حصہ ہے۔ انسان ایک کام تھوڑی دیر میں کر لیتا ہے اور پھر اسے پورے دن، بلکہ بعض اوقات پورے سال کی طرف منسوب کر کے بیان کرتا ہے، مثلاً ”میں نے اسی سال فلاں شخص سے ملاقات کی“، میں آج ہی اس کے پاس گیا تھا“ یہی صورت آیت میں بھی ہے۔

دقیقہ صفحہ ۳۴) لوگ عمرہ کے لیے بھی خاص طور سے سفر کر کے آیا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوبارہ سفر کی استطاعت ہی نہیں رکھتی ان کے لیے تو افراد کے مقابلہ میں تمتع وقران کے افضل ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں لیکن اگر کوئی اس طرح کرتا ہے کہ صرف حج کے لیے ایک سفر اور پھر دوبارہ صرف عمرہ کے لیے ایک الگ سفر اختیار کرتا ہے تو افراد کی یہ صورت یقیناً افضل ہوگی۔ دو سفروں میں افراد کی صورت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی ”موطا“ میں لکھی ہے اور اس کی اخصیبت کی تصریح کی ہے۔ شیخین سے اس میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے اور یہی وہ صورت ہے جسے عمر رضی اللہ عنہ نے پسند کیا تھا۔ (مترجم)

”فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ“ پس جس نے ان مہینوں میں حج کو اپنے اوپر واجب کیا۔ اپنے اوپر واجب کرنے کا مطلب ہے ”یہ ارادہ کرنا کہ اللہ نے حاجی پر جو کچھ واجب کیا ہے اس کی ادائیگی کرے گا اور جن سے روکا ہے ان سے رکے گا“ آیت میں ”فرض“ کا مفہوم عام مفسرین کے نزدیک ”واجب کرنا، لازم کرنا“ ہے، لیکن اس سلسلے میں رائے مختلف ہے کہ حج واجب و لازم ہوتا کس عمل کے ذریعے ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ حج لازم نیت اور تلبیہ کہنے سے ہو جاتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ، عطاء، سفیان ثوری، مجاہد، ابراہیم، طاؤس اور قاسم بن محمد رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے، قاسم بن محمد کی روایت میں ہے کہ غسل کر کے تلبیہ کہتے ہوئے احرام کا کپڑا پہن لینے سے حج واجب و لازم ہو جاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ احرام باندھ لینے سے حج واجب ہو جاتا ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابراہیم، عطاء، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ ان حضرات نے فرمایا کہ ”احرام“ سے حج لازم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قول میں ابہام ہے۔ ممکن ہے اس سے نیت اور اعمال حج کے لئے نیت کے ساتھ تلبیہ کہنا مراد ہو، جیسا کہ پہلے قول میں کہا گیا ہے اور ممکن ہے اس سے مراد عزم و ارادہ حج ہو، جیسا کہ ہماری رائے ہے، یعنی احرام سے مراد یہ عزم و ارادہ لیا جائے جس کے ذریعے حرم اپنے اوپر وہ امور لازم کر لیتا ہے جو حج کرنے والے پر لازم ہیں۔ ہم نے یہ قول اس لئے پسند کیا کہ یہی ایک ایسی جامع صورت ہے جو بہر حال حج کے امور شروع کرنے کے لئے ضروری ہے۔

”فَلَا رَفَثَ“ (تو ”رفث“ نہ ہونے پائے) بعض مفسرین نے ”رفث“ کے معنی عورت کے ساتھ فحش اور موجب شہوت باتیں کرنا، مراد لیتے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ جب احرام کھولیں گے تو یہ کریں گے اور وہ کریں گے، صاف اور واضح طور پر ایسی باتیں کہنا ”رفث“ ہے یہ قول ابن عباس، ابن زبیر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم، عطاء، طاؤس، ابولعاب سے نقل ہے۔ اس میں بوس و کنار اور جماع و مباشرت کے مبادی آجاتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”رفث“ سے آیت میں مراد جماع و مباشرت ہے۔ یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتوں میں منقول ہے۔ حسن، عمر بن دینار، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، سدی، ربیع، ابراہیم، عکرمہ، ضحاک اور ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہم سے بھی اس قول کی روایت ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی روایت ہے ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَأُحِلَّ لَكُمْ كَيْدَ الْأَصْيَافِ الرَّفَثِ إِلَى نِسَاءِكُمْ“ (جائز کر دیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا) میں بھی ”رفث“ سے جماع ہی مراد ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ کلام عرب میں یہ لفظ اصلاً ”فحش گوئی“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ معنی اصلی تو یہی ہیں، لیکن کنایۃً اسے ”جماع و مباشرت“ کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ اہل علم کی رائے اس آیت میں اس لفظ کے مفہوم کی تعین کے سلسلے میں مختلف ہے، یعنی یہ کہ یہاں محرم کو ان تمام امور سے روکا گیا ہے جن پر لفظ ”رفث“ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا ان میں سے صرف بعض مخصوص امور سے ہی روکا گیا ہے۔ تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم وہ تمام ہی امور مراد لیں جن پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے، کیونکہ جب تک قرآن و حدیث سے اس کا تعین نہ ہو جائے کہ آیت میں صرف بعض ہی امور ان سے مراد ہیں، ہمیں تمام ہی امور مراد لینے پڑیں گے (جس میں جماع اور دعاوی جماع تمام امور آجاتے ہیں) ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث سے اسکا

کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بعض ہی امور مراد ہیں۔

”وَلَا فَسُوقَ“، مفسرین اس کی تفسیر میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ بعض حضرات نے ”فسوق“ سے مراد گناہ لیے ہیں، خواہ وہ کسی قسم کے ہوں۔ مفہوم یہ ہو گا کہ ”اور کوئی گناہ نہ ہونے پاتے“۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ، عطاء بن عصفار، حسن، طاؤس، مجاہد، محمد بن کعب قرظی، قتادہ، سعید بن جبیر، ابراہیم، ربیع، عکرمہ اور زہری رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں مراد ”فسوق“ سے خاص احرام کے سلسلے کی عدول حکمی ہے یعنی حالت احرام میں جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا کہ شکار نہ ذبح کیا جائے، بال یا ناخن نہ ترشوائے جائیں وغیرہ، انہیں سے کسی میں حکم عدول نہ ہونے پاتے۔ یہ روایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ”فسوق“ سے آیت میں مراد گالم گلوچ ہے، یعنی گالم گلوچ نہ ہونے پاتے۔ اس تفسیر کی روایت بھی ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے۔ سدی، ابراہیم، عطاء بن یسار اور مجاہد رحمہم اللہ سے بھی اس تفسیر کی روایت ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ”بتوں کے لیے ذبح کرنا“ ہے۔ اس کی روایت ابن زید سے ہے۔ پانچواں قول جس کی روایت ضحاک بن مزاحم سے ہے، یہ ہے کہ مراد ”لوگوں کے برے نام رکھنا“ ہے۔ میرے نزدیک راجح تفسیر ان حضرات کی ہے جنہوں نے کہا کہ آیت میں ”فسوق“ سے مراد خاص حالت احرام سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام سے محرم کی عدول حکمی ہے۔ ذکر ج ہی کا ہے، اور اس سے پہلے ”لا رقت“ میں بھی خاص حالت احرام ہی کے ایک ممنوع عمل سے روکا گیا ہے۔ اس لیے ”فسوق“ سے بھی اسی قبیل کے اعمال سے ممانعت ہوگی۔

”وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ“ کی تفسیر بھی مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آیت میں کہا گیا ہے کہ محرم کسی سے جھگڑا نہ کرے۔ جن حضرات نے یہ تفسیر کی ہے ان میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ آیت میں محرم کو جھگڑا کر کے اپنے ساتھی کو ناراض کرنے سے روکا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عطاء، سعید بن جبیر، مجاہد، عمرو بن دینار، حسن، ضحاک، ربیع، ابراہیم، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ”جدال“ سے آیت میں مراد گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑا ہے۔ (خواہ کسی سے ہو)۔ ابن عمر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ سے اس کی روایت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد عام جھگڑا نہیں ہے، بلکہ وہ خاص بحث و جدال مراد ہے جو قریش موسم حج میں منیٰ میں جمع ہو کر کرتے تھے، کچھ لوگ کہتے کہ ہمارا حج تمہارے مقابلہ میں زیادہ کامل ہے، اور ان کے مقابلہ کے کچھ لوگ اپنے حج کو زیادہ کامل ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ محمد بن کعب قرظی سے اس کی روایت ہے۔ قاسم بن محمد سے چوتھی روایت ہے کہ اس سے مراد ان کا آپس کا حج کے دن کے سلسلے میں اختلاف ہے، بعض کہتے حج آج ہے اور بعض اس کے مقابلہ میں کہتے کہ حج کل ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ موقف ابراہیم کے بارے میں عرب جاہلیت کا اختلاف مراد ہے، ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے

فرمایا کہ وہ لوگ مختلف جگہوں پر ٹھہرتے اور ہر فریق اس کا دعویٰ کرتا کہ یہی موقف ابراہیمؑ ہے۔ آیت میں اس نزاع و اختلاف سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تمام مناسک حج بتا دیئے ہیں۔ اختلاف و نزاع کی اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔

چھٹا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حج میں کوئی شبہ نہیں رہا، اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ حج کا وقت متعین ہو گیا ہے، اس میں اب کسی قسم کی تقدیم و تاخیر نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی مہینے کو حذف کیا جاسکتا ہے۔ اس کی روایت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں دو قتی ضروریات کے پیش نظر کبھی محرم کے مہینے کو حذف کر دیتے، کبھی صفر اور ربیع الاول کے مہینوں کو "دو صفران" (دو صفر) کا نام دیتے کبھی ربیع الآخر اور جمادی الاول کے مہینوں کو "شہرا ربیع" (ربیع کے دو مہینے) کہتے، کبھی جمادی الاخریٰ اور رجب کو "جمادیان" (دو جمادی) کہتے، کبھی وہ شعبان کو رجب بنا دیتے، کبھی رمضان کو شعبان، کبھی شوال کا نام رمضان رکھ لیتے، کبھی ذی قعدہ کو شوال کر لیتے اور ذی قعدہ کو ذی الحجہ کہتے، کبھی محرم کو ذی الحجہ بنا لیتے اور اس طرح محرم کے مہینے میں حج کرتے۔ مہینوں کا شمار وہ انھیں غلط بنیادوں پر غلط ناموں کے ساتھ کرتے، اور سال میں دو دو مرتبہ حج کر لیتے۔ اس غلط شمار کے ساتھ وہ محرم میں ایک حج کر لیا کرتے تھے، تاکہ سال میں دو حج کر سکیں۔ ارشاد ہے کہ اب اللہ تعالیٰ نے حج کا وقت متعین کر دیا ہے، اس لئے نہ اس میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے اور نہ کسی مہینے کا درمیان میں حذف و اضافہ کیا جاسکتا۔ اس قول کی روایت سدی سے بھی ہے۔

مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ اہل عرب دو سال ذی الحجہ میں حج کرتے، دو سال محرم میں کرتے، اس طرح وہ سال کے ہر مہینے میں دو دو سال حج کیا کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو سب سے پہلا حج کیا یہ ذی قعدہ میں تھا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج سے ایک سال پہلے تھا۔ پھر آں حضور نے دوسرے سال ذی الحجہ کے صحیح مہینے میں حج کیا۔ حضور اکرم کی اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ گھوم کر پھر ٹھیک اس دن کے مطابق ہو گیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کی تھی۔

ان تمام اقوال میں راجح تفسیر یہ ہے کہ حج کے سلسلے میں جاہلیت کے نزاع و اختلاف باطل ہو گئے، اب اس کے وقت اور مناسک کے سلسلے میں اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان تمام امور کی تعیین کر دی ہے، اب حج کا ایک متعین وقت ہے اور اس کے مناسک بھی متعین ہیں۔ اس تفسیر کے راجح اور پسندیدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ ارشاد تھا کہ "حج کے مہینے متعین ہیں" اور اب اس کے بعد ان اختلافات اور جھگڑوں کو باطل قرار دیا جا رہا ہے جو جاہلیت میں اس سلسلے میں موجود تھے۔ اس سے پہلے "لا فسق" کی تفسیر کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ معاملات حج ہی کا بیان ہو رہا ہے، اس لئے اس ضمن میں جو کچھ بھی ارشاد ہو گا وہ خاص حج ہی سے متعلق ہو گا، ان امور کے بیان کی یہاں کوئی وجہ نہیں ہو سکتی جو حج کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی جائز نہیں، کہ وہ تو ہر حال جائز نہیں ہیں، حج کے خصوصی بیان میں ان کے ذکر کی آخر ضرورت کیا ہو سکتی ہے!۔ ناحق اپنے ساتھی کو ناراض کرنا، اس کے لئے باعث آزار بننا ہر حال میں ممنوع ہے۔ گالی دینا بھی گناہ ہے، حضور اکرم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اور قتل کرنا کفر ہے۔ یہ امور تو ہر حال میں گناہ ہیں، اس لئے حج کے خصوصی موقع پر مراد نہیں لیجے جاسکتے۔

ان سے بھی قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی اس تفسیر کے راجح ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ حضور نے ارشاد فرمایا، جس نے اللہ کے اس گھر کا حج کیا، اور دورانِ احرام میں نہ کوئی عورت سے فحش بات (رفت) کی اور نہ بے حکمی (فسوق) کی تو وہ یہاں سے اس دن کی طرح نکلے گا (بے گناہ) جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی بعض روایتوں میں ہے کہ ”وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسا کہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا، بعض روایتوں میں یہ ہے کہ ”اپنے گھر کی طرف اس طرح لوٹے گا“ ائمہ مذکورہ بالا مضمون کی متعدد روایتیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی منقول ہیں۔ اس حدیث میں آیت میں مذکور تین امور ”رفت“، ”فسوق“ اور ”جدال“ میں سے صرف پہلے دو امور کا ذکر ہے، کہ جو شخص اپنے حج میں ان سے بچا رہے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنے مخصوص اکرام سے نوازیں گے اور اس کے گناہ معاف کر دیں گے اگر ”جدال“ کا مفہوم آیت میں وہ نہ ہوتا جو ہم نے لیا ہے تو ”رفت و فسوق“ کے ساتھ اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا، حدیث کی تمام روایتوں میں اس کے بغیر صرف دو پہلے ہی امور کو ذکر کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس میں کسی چیز سے نہی و ممانعت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خبر و اطلاع ہے کہ حج کے مناسک اور وقت کے سلسلے میں جاہلیت کے تمام نزاع و اختلاف باطل ہو گئے۔ اگرچہ ”فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ“ میں صحیح قرارت یہی ہے کہ تینوں کا اعراب ایک ہی پڑھا جائے، لیکن میرے نزدیک پسندیدہ قرارت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ”رفت“ اور ”فسوق“ پر ضم مع الثنویں پڑھا ہے اور ”جدال“ پر نصب پڑھا ہے، تاکہ دونوں ٹکڑوں کے مفہوم کا اختلاف عبارت میں بھی صاف ہو جائے یہ قرارت بصرہ کے قاریوں کی ایک جماعت اور اکثر اہل مکہ کی ہے۔

”وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْتَدِلُهُ اللَّهُ“ یعنی اے مسلمانو! میں نے حج کے فرائض اور اس کے مناسک کی پوری طرح ادائیگی اور اس کے ممنوعات سے اجتناب کا جو تمہیں حکم دیا ہے تو اس پر عمل تمہارے لیے بہت بڑے ثواب کا باعث ہوگا، کیونکہ ”تم جو بھی نیک کام کرو گے اللہ اسے ضرور جان لے گا“، اللہ ہر کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ تمام چھپی ہوئی اور ظاہر چیزوں کو جانتا ہے۔

”وَتَزَوَّدُ فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى“ (اور زاد راہ لے لیا کرو، اور بہترین زاد راہ تو تقویٰ ہے) بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو بغیر زاد راہ کے سفر حج کے لیے نکل پڑتے تھے، کچھ ایسے بھی تھے کہ احرام باندھتے وقت جو کچھ زاد راہ ہوتا وہ پھینک دیتے اور دوسرا نیا زاد راہ لیتے۔ اس لیے آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو سرے سے زاد راہ ساتھ لیتے ہی نہیں تھے، اسے ساتھ لینے کا، اور جو موجود زاد راہ کو پھینک دیتے انہیں اس کی حفاظت کا حکم دیا۔ نافع ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ احرام باندھتے وقت اپنے پاس موجود زاد راہ پھینک دیتے اور اس کے بجائے نیا زاد راہ ساتھ لیتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ایسا نہ کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بعض لوگ سفر حج میں زاد راہ ساتھ نہیں لیتے تھے، اس لیے حکم ہوا کہ سفر حج کے لیے نکلنے وقت زاد راہ بھی لے لیں، اور بہترین زاد راہ تو تقویٰ ہے اس مضمون کی روایتیں سعید بن جبیر، عکرمہ، شعبی، سالم، ابراہیم، جہاد، حسن، سعید بن ابی عمرو، قتادہ، ربیع، ضحاک، سفیان اور ابن زید رحمہم اللہ سے نقل ہیں۔ ابراہیم کی روایت میں ہے کہ کچھ عربی حج کے لیے بغیر زاد راہ کے نکل پڑتے تھے اور

اور کہتے تھے کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ مجاہد کی روایتوں میں ہے کہ مکہ معظمہ کے اطراف کے کچھ لوگ زادراہ کے بغیر نکل پڑتے اور پھر لوگوں سے مانگتے اور کہتے کہ ہمارا توکل اللہ پر ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ زادراہ ساتھ لے لیا کریں مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ اہل یمن ایسا کیا کرتے تھے۔ قتادہ اور حسن کی روایت میں بھی اہل یمن ہی کا ذکر ہے۔ عبد الملک بن عطار بکالی کہتے ہیں کہ شعبی نے فرمایا کہ ”زادراہ“ سے مراد کھانا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ”کھانا“ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا کہ کھجور، ستوا، اور یہ بھی اس زمانہ میں بہت کم تھے۔ ضحاک نے فرمایا کہ دنیا کا زادراہ لباس، کھانے، پینے سے نفع حاصل کرنا ہے۔ مختلف روایتوں میں زادراہ سے مراد ستوا، آٹا، کھجور اور زیتون وغیرہ لیا گیا ہے۔ ان روایتوں کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جب حج کے مہینوں میں احرام باندھو تو تمام فرائض و مناسک کی پوری طرح ادائیگی کرو اور جن چیزوں سے تمہیں روکا گیا ہے ان سے رکنے رہو، اللہ نے حج کے تمام امور تمہیں بتا دیئے ہیں اور ان کی تعیین کر دی ہے، اس لیے اس کے احکام و منہیات کے سلسلے میں تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ تم جو بھی نیک کام کرو گے اس کا اللہ کو علم ہوگا، اور اپنا زادراہ اپنے ساتھ رکھو، تاکہ فرائض و مناسک کی ادائیگی اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ کر سکو، اس میں کوئی نیکی نہیں کہ زادراہ ساتھ نہ لو اور پھر لوگوں سے مانگتے پھرو، اور نہ زادراہ کو ضائع کر دینا کوئی نیک کام ہے، بلکہ نیکی اللہ رب العزت سے تقویٰ میں ہے کہ اس نے حج میں جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کی بجا آوری کرو، اور جن چیزوں سے روکا ہے ان سے اجتناب کرو، کہ یہی سب سے بہترین زادراہ ہے۔ ضحاک بن مزاحم نے فرمایا کہ ”تقویٰ“ سے مراد اللہ کی طاعت ہے۔ اس سے پہلے ہم ”تقویٰ“ کے معنی بیان کر چکے ہیں۔

”وَ اتَّقُونَ يَا اُولِي الَاْنْسَابِ“ یعنی اے اصحاب عقل و فہم، میرا ہی تقویٰ اختیار کیے رہو، حج کے سلسلے میں میرے فرائض و مناسک کی ادائیگی اور میری تمام شریعت پر عمل کر کے اور میری سزا سے ڈرو اور میری حرام کی ہوتی چیزوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ خاص طور سے ”اہل فہم“ سے خطاب اس لیے کیا کہ انھیں لوگوں کو حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے، اور انھیں کو فکر صحیح حاصل ہے اور وہی حقائق کی معرفت رکھتے ہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ فَاِذَا

تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ حج میں، معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پھر جب

اَفْضَلُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ

تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (مزدلفہ میں شب کو قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو

وَ اذْكُرُوا كَمَا هَدَاكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ

اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے (نہ یہ کہ اپنی رائے کو دخل دیا) اور حقیقت میں قبل اس کے تم محض نادان ہی تھے

شَرًّا فَيُضِلُّوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ

پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں پرانی رسموں پر عمل کر نیسے)

إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ ۝۳

خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرنا یقیناً اللہ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرمائیں گے۔

ہم خرما و ہم ثواب

”وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ“ ”جُنَاحٌ“ بمعنی حرج ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ ”احرام سے پہلے اور احرام کے بعد خرید و فروخت میں تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ ”أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ“ یعنی اپنے پروردگار کے ہاں سے فضل و معاف تلاش کرنے میں ”رَبِّكُمْ“ کوئی حرج نہیں ہے۔ بولتے ہیں ”رَبِّكُمْ“ اللہ ہے۔ یعنی میں نے اللہ کا فضل تلاش کیا۔ ”رَبِّكُمْ“ بمعنی طلب و التماس استعمال ہوتے ہیں۔

مفسرین نے کہا ہے کہ ”رَبِّكُمْ“ کا مفہوم ہے ”تجارت کے ذریعہ اللہ کی روزی کی تلاش“ ان کا خیال ہے کہ کچھ لوگ سفر حج میں تجارت صحیح نہیں سمجھتے تھے، وہ تجارت نہ کرنا ہی نیکی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے، بلکہ انہیں اس سفر میں بھی خرید و فروخت کے ذریعہ اللہ کے فضل کی تلاش کرنی چاہیے۔ یہ تفسیر حجاب، بریدہ، عکرمہ، منصور بن معتمر، عطار، سعید بن جبیر، سدی، ربیع بن انس، ابراہیم، قتادہ رحمہم اللہ اور عمر، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ ابوامامہ تمیمی روایت کرتے ہیں کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ تم تاجر لوگ ہیں، تو کیا ہمارا حج صحیح ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا: کیا تم بیت اللہ کا طواف نہیں کرتے؟ عرفہ نہیں جاتے؟ کنکری نہیں پھینکتے؟ سر نہیں منڈالتے؟ میں نے عرض کی کہ ہم یہ سب سمجھ کر کرتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ حضور سے بھی یہی سوال کیا، آپ حضور نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا، لیکن حضور ہی دیر بعد جبریل علیہ السلام نے اور مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ آپ حضور نے ان سے فرمایا کہ تمہارا حج صحیح ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ عکاظ اور ذوالحجۃ موسم حج میں جاہلیت کے بازار تھے۔ اسلام کے بعد گویا لوگوں نے یہاں خرید و فروخت غیر مناسب سمجھی۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت نازل ہوئی۔ مجاہد کی ایک روایت میں ہے کہ ان بازاروں میں موسم حج کے موقع پر تجارت ہوا کرتی تھی، آیت نازل ہوئی۔ مشرکین قیام عرفہ کے دن خرید و فروخت نہیں کرتے تھے۔ اسی مضمون کی روایت قتادہ سے بھی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ مسلمان موسم حج میں تجارت پسند نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ذکر کے دن ہے۔ اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

”وَأَذَانُ أَفْضَلٌ مِّنْ عَرَفَاتٍ“ (پھر جب تم عرفات سے واپس ہونے لگو گے) ”وَأَذَانُ أَفْضَلٌ“ یعنی پھر جہاں سے تم نے ابتداء کی ہے وہاں سے واپس ہونے لگو۔ عرفات جمع کا وزن ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصلاً یہ صیغہ اگر جمع کے لیے ہے لیکن یہاں

لے مکہ معظمہ سے جانب مشرق میں طائف کو جاتے ہوئے، تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر عرفات پڑتا ہے۔ یہ کمی میل کے رقبہ کا لمبا چوڑا میدان ہے۔ اسی نام کی ایک پہاڑی بھی اس میدان میں ہے۔ سال بھر یہ میدان بالکل سبناں پڑا رہتا ہے، صرف ایک دن باقی برصغیر آندا

مراد ایک ہی قطعہ زمین ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ خاص میدان عرفہ اور اس کے اطراف کو عرفات کہا گیا ہے۔ بعض علماء اس میدان کے "عرفات" نام کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب پہلی مرتبہ لے دیکھا تھا تو فوراً پہچان گئے تھے، کیونکہ آپ کو اس کے اوصاف و خصوصیات معلوم تھیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا تھا کہ "قَدْ عَرَفْتُ" (میں نے پہچان لیا)۔ یہ ان حضرات کی رائے ہے جو کہتے ہیں کہ عرفات نام تو ہے اس خاص میدان کا، لیکن نام رکھنے میں اس خاص میدان کے ساتھ اس کے اطراف کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ سمدی سے روایت ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا تو انہوں نے اس کا جواب تلبیہ (اللہم لبیک الخ) سے دیا اور وہاں جسے آنا تھا وہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ عرفات کی طرف جائیں اور اس کے اوصاف آپ سے بیان کر دیئے تھے۔ چنانچہ آپ نکل پڑے۔ جب آپ مقام عقبہ کے درخت کے پاس پہنچے تو شیطان آپ کے سامنے آگیا اور آپ کو واپس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں، اور ہر کنکری پر آپ تکبیر کہتے جاتے تھے۔ اس وقت شیطان بھاگ گیا۔ لیکن جب آپ حجرہ ثانیہ (جہاں دوسری مرتبہ کنکری ماری جاتی ہے) پہنچے تو پھر اس نے آپ کو روکنے کی کوشش کی، اس وقت بھی آپ نے اسے کنکری ماری۔ وہاں سے بھی وہ بھاگ گیا۔ حجرہ ثالثہ (جہاں تیسری مرتبہ کنکری ماری جاتی ہے) کے موقع پر پھر شیطان سدراہ ہوا، اس وقت بھی آپ نے تکبیر کہتے ہوئے اسے کنکری ماری۔ شیطان بھی سمجھ گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اس کی ماننے والے نہیں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائیں، اتنے میں آپ مقام "ذوالحجاز" پر پہنچے، آپ نے اس مقام کو دیکھا اور نہ پہچان کر گذر گئے، (جہاں) اسی لیے اس کا نام "ذوالحجاز" پڑا۔ آپ آگے بڑھے اور عرفات میں پہنچ گئے۔ لے دیکھتے ہی اس کے اوصاف کی وجہ سے پہچان گئے اور فرمایا کہ "قَدْ عَرَفْتُ" (میں پہچان گیا)۔ پھر ابراہیم علیہ السلام وہیں عرفات کے میدان میں شام تک ٹھہرے، شام کے وقت آپ مزدلفہ سے قریب ہوئے، اور اسی لیے اس کا نام "مزدلفہ" پڑا اور وہاں آپ نے قیام کیا۔ عرفات نام پڑنے کی وجہ کے سلسلے میں مذکورہ بالا وجہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور نعیم بن ابی ہند کی روایتوں میں بھی اختصاً کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ عرفات نام اس خاص میدان اور اس کے سوا دوسرے مقامات کی وجہ سے پڑا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ عرفات نام اس لیے پڑا کہ جبریل علیہ السلام مناسک حج کو دکھاتے وقت فرماتے جاتے تھے کہ یہ فلاں مقام ہے، یہ فلاں مقام ہے، اور ابراہیم علیہ السلام فرماتے کہ میں نے پہچان لیا اسی مناسبت سے اس خاص میدان کا نام عرفات پڑا۔ اختصار کے ساتھ یہ قول عطار سے بھی نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اصلاً یہ اس پہاڑ کا نام ہے جو وہاں پر ہے اور اس کے بعد حج میں ٹھہرنے کی جگہ ہو۔ ابن ابی شیبہ نے فرمایا کہ مقام تبعہ، تلبیعہ اور ذات البنات کے مجموعہ کا نام عرفات ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں آدہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۹ ذی الحجہ کو انسانوں اور سواریوں سے کچھ کچھ بھر جانا ہے۔ حج کے واجبات و سنن تو بہت ہیں، لیکن فرض صرف تین ہیں، احرام پوشی، ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں حاضری اور طواف فرض۔ ان تینوں میں اہم ترین یہی عرفہ کی حاضری ہے۔ (مستنجم)

”فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ“ یعنی جب تم عرفہ سے اس طرف لوٹنے لگو جہاں سے عرفہ کی طرف روانگی کی ابتداء کی تھی ”تو مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کر لیا کرو“ اللہ کے ذکر سے مراد نماز و دعا ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ”مَشْعَر“ بمعنی علامت و نشانی ہے ”شَعْرَتْ بِهَذَا الْأَمْرِ“ سے ماخوذ ہے، یعنی اس معاملہ کو سمجھ گیا، جان گیا۔ ”مَشْعَر“ اس مقام کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں نماز پڑھنا، ٹھہرنا، رات گزارنا اور دعا کرنا حج کی نشانیوں اور اس کے واجبات میں سے ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ابن ابی نجیح نے فرمایا کہ حاجی کے لیے مستحب ہے کہ اگر ہو سکے تو نماز مزدلفہ میں اپنے پڑاؤ پر پڑھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ”مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کر لیا کرو، اور اس کا ذکر اس طرح کرو جس طرح اس نے تمہیں بتایا ہے“ ”مشعر“ سے مراد وہ مقام ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان میں ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے دیکھا کہ لوگ مزدلفہ کی پہاڑی پر ہی ہجوم کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ تمام مزدلفہ ”مشعر“ ہے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ پہاڑی اور اس کے چاروں طرف کا علاقہ مشعر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان کا علاقہ مشعر ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ”مشعر الحرام“ کے متعلق پوچھا، تو آپ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ رہو تو میں تمہیں دکھا دوں گا۔ چنانچہ جب لوگ عرفہ سے واپس ہونے لگے اور سواریاں پہاڑ کے دامن میں پہنچ جائیں تو وہاں سے مکہ تک ”مشعر“ ہے۔ مکحول ازوی کی روایت میں ہے کہ میں نے ”مشعر حرام“ کے متعلق ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو آپ مجھے مزدلفہ تک ساتھ لے گئے اور وہاں پہنچ کر فرمایا کہ یہی مشعر ہے۔ مجاہد، عطاء، قتادہ، سدی، ربیع، سعید بن جبیر رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے کہ ”مشعر حرام“ سے مراد مزدلفہ ہے۔ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، پورا میدان عرفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے سوا عرفہ کے، اور پورا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے سوا محسر کے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ وادی محسر کے سوا پورا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ آپ نے ایک خطبہ میں فرمایا کہ جان لو کہ سوا بطن عرفہ کے سارا میدان عرفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے، اور سوا بطن محسر کے سارا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ البتہ میرے نزدیک حاجی کے لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کے لیے مزدلفہ کے قریب ہی اس کے قریب ٹھہرے، کیونکہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں صبح کی تو آپ مقام قریح میں ٹھہرے اور اپنے پیچھے سواری پر فضل رضی اللہ عنہ کو بٹھایا پھر فرمایا کہ یہ ٹھہرنے کی جگہ ہے، اور سارا مزدلفہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ ابو الجوزی نے بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ

سے ”مشعر حرام“ اس مقام کا نام ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ سارے مزدلفہ کو بھی ”مشعر حرام“ کہتے ہیں۔ تمام اہل علم کے نزدیک اس سے مراد مزدلفہ ہی ہے۔ مکہ معظمہ سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مکہ سے عرفات کا ایک تو سیدھا راستہ ہے، اور ایک ذرا چکر کا ہے۔ عرفات سے مکہ معظمہ واپسی کا حکم اسی دوسرے راستے سے ہے جس میں مزدلفہ پڑتا ہے۔ حاجیوں کے قافلے ارذی الحج کی ابتداء رات میں یہاں پہنچ جاتے ہیں اور رات پہنچا، تھیلے، تسبیح، دعا، واسطیخار میں گزارتے ہیں۔

کو تمام قرح میں کھڑے دیکھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔
 عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ ”یہاں سے مکہ تک سارا علاقہ مشعر حرام ہے“ تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تمام حج کی
 نشانیوں ہیں، اور مزدلفہ سے مکہ تک کے ایک ایک علاقہ میں حج سے متعلق کوئی نہ کوئی عمل کیا جاتا ہے۔ یہ مطلب آپ کے
 ارشاد کا نہیں ہے کہ مزدلفہ کا قیام، جو ارذی الحج کی اول شب سے شروع ہوتا ہے، یہاں سے مکہ تک کیا جاسکتا ہے۔
 ”وَإِذْ كَرُّوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ“ (اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا کہ اس نے
 تمہیں بتایا ہے، اور یقیناً تم اس سے قبل ناواقفوں میں تھے) یعنی اسے مسلمانوں یا مشعر حرام میں اللہ کا ذکر اس کی تعریف
 اور اس کی نعمتوں کے شکر کے ذریعہ کرو، اور تمہارا یہ ذکر اللہ کے سامنے خشوع و خضوع، اس کے سامنے جھکنا اور اس کی
 نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے مطابق ہو، ورنہ تم اس سے پہلے
 شرک اور حیرانی میں مبتلا تھے، حق کا راستہ تمہیں معلوم نہیں تھا، لیکن اللہ نے تمہیں صحیح راستہ بتایا، تم جہنم کے کنارے پہنچ چکے
 تھے، لیکن اللہ نے تمہیں اس کی آگ سے نجات دی۔ یہ مفہوم ہے ”كَمَا هَدَاكُمْ“ کا۔ ”وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ
 لَمِنَ الضَّالِّينَ“ کا مفہوم یہ ہے کہ ”تم اللہ کی اس ہدایت سے پہلے، جبکہ اس نے تمہیں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا
 راستہ دکھایا، ناواقفیت میں تھے“

”ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ“ دیکھو تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں (مفسرین کے
 اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ آیت میں ”لوگ“ سے کون لوگ مراد ہیں، اور یہ کہ کس طرح کی واپسی کے لیے کہا گیا ہے؟
 بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خطاب قریش سے ہے، قبیلہ قریش کے لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنے کو ”حمس“ کہتے تھے، اور
 حج کے موقع پر دوسرے قبائل کے لوگوں کی طرح عرفات میں جا کر نہیں ٹھہرتے تھے، بلکہ کہتے کہ ہم حرم سے باہر نہیں
 جائیں گے۔ اسلام میں انہیں بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ جہاں سے لوگ جا کر واپس آتے ہیں تم بھی وہاں جا کر واپس آؤ۔ عائشہ
 رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش اور ان کے متبعین اپنے آپ کو حمس کہتے اور (وقوف عرفہ کے دن) مزدلفہ میں ہی
 ٹھہرتے اور کہتے کہ ہم اللہ کے حرم کے باشندے اور اس کے خادم ہیں۔ ان کے سوا دوسرے لوگ اس دن میدان عرفہ میں
 ٹھہرتے تھے، اس لیے انہیں بھی حکم ہوا کہ اور لوگوں کی طرح تم بھی عرفہ میں ٹھہرا کر واپس آؤ اور پھر وہاں سے واپس آیا کرو۔ عروہ رحمۃ اللہ
 علیہ سے روایت ہے کہ آپ نے عبد الملک بن مروان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے متعلق، کہ آں حضور نے
 قبیلہ انصار کے ایک صحابی سے فرمایا تھا کہ میں بھی ”حمس“ ہوں، لکھا کہ مجھے (سن کر) معلوم نہیں کہ آں حضور نے یہ حدیث ارشاد
 فرمائی تھی یا نہیں، البتہ یہ میں نے سنا ہے کہ یہ حدیث آں حضور کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ ”حمس“ جاہلیت اور شرک
 کے زمانہ میں قریش کی ملت کو کہتے ہیں، اور قریش کی اولاد خزاعہ اور بنی کنانہ کے قبائل میں شامل ہیں۔ یہ لوگ عرفہ جا کر واپس
 نہیں آتے۔ تھے، بلکہ مزدلفہ سے ہی (جو حدود حرم میں ہے) واپس آجاتے تھے۔ بنو عامر بھی حمس تھے۔ انہیں لوگوں کے
 متعلق آیت میں ارشاد ہے کہ عرب کے دوسرے قبائل کے لوگوں کی طرح تم بھی عرفہ جا کر واپس آیا کرو۔ ابن عباس
 رضی اللہ عنہما، عطار، مجاہد، قتادہ، سدی، ربیع اور عبد اللہ بن ابی نیح رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی
 ایک روایت میں ہے کہ عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ ملائکہ کے جلو میں آسمان دنیا پر آجاتا ہے اور فرماتا ہے، میرے بندو،
 میری طرف آؤ، میرے وعدہ پر ایمان لاؤ اور میرے رسول کی تصدیق کرو۔ پھر فرماتا ہے کہ ان کی جزا کیسا ہے؟ عرض

کیا جاتا ہے کہ ان کی جزا یہ ہے کہ آپ انھیں معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس زیر تفسیر ارشاد سے یہی مراد ہے کہ ”پھر تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہ اللہ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں،“ قنادہ کی روایت میں ہے کہ قریش کہتے تھے کہ ہم اللہ کے اہل ہیں، اس لیے اس کے حرم سے باہر نہیں جائیں گے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ تم بھی حرم سے باہر عرفہ میں جا کر واپس آؤ، کیونکہ یہی ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔ عبد اللہ بن ابی نیحج نے فرمایا کہ معلوم نہیں، جس کا یہ تصور قریش میں ابراہیم کے ہاتھیوں کے واقعہ سے پہلے سے موجود تھا یا بعد میں پیدا ہوا، یہ ان کا اپنا ایک تخیل تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، حرم کے رہنے والے، اس کے مٹولی اور خادم ہیں، اس لیے ہمارا مرتبہ اور ہمارا حق تمام عرب سے بڑھ کر ہے، اس لیے اور عربوں کی طرح ہم حرم سے باہر کسی چیز کی عظمت نہیں کر سکتے، کیونکہ قریش بھی اگر ایسا کرنے لگے تو عرب کے دوسرے قبائل حرم کا استخفاف کرنے لگیں گے۔ اسی تصور کے نتیجہ میں انھوں نے عرفہ میں ٹھہرنا اور وہاں سے واپس آنا چھوڑ دیا، حالانکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ وہ بھی ”مشاعر ج“ میں سے ہے اور دین ابراہیمی کے مطابق ہے۔ اس روایت میں بہت سی بدعتوں کا بھی ذکر ہے جو قریش نے..... حج کے سلسلے میں ایجاد کی تھیں، اور بہت سی پابندیاں دوسرے عرب قبائل پر عائد کی تھیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”پھر تم وہاں جا کر واپس آؤ“ میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے، اور ”جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں“ سے مراد مزدلفہ ہے، ”لوگ“ سے اشارہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ہے۔ ضحاک سے روایت ہے کہ مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ لیکن صحیح رائے پہلی ہی ہے، کہ اسی پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”جو کوئی حج اپنے اد پر لازم کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے، نہ بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا۔ پھر تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بے شک اللہ بڑے مغفرت کرنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں۔ اور تم جو بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا“ اس مفہوم کی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ آیت میں تقدیم ماحقہ، التاخیر کے اصول سے کام لیا گیا ہے، یعنی ترتیب میں جو مقدم تھا اسے بیان میں مؤخر کر دیا گیا ہے اور جو مؤخر تھا اسے مقدم بیان کیا گیا، کیونکہ آیت ”اور تم جو بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا“ اصل میں بعد کا مضمون ہے، لیکن ایک عربی قاعدہ کے مطابق بیان سب سے پہلے کر دیا گیا ہے۔

اگر مفسرین کا پہلے قول پر اتفاق نہ ہوتا تو میں دوسرے قول کو جس کی روایت ضحاک سے ہے، ترجیح دیتا، یعنی یہ کہ ”والناس“، ”لوگ“ سے ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ عرفات سے واپسی مزدلفہ سے واپسی اور وہاں اللہ کے ذکر سے پہلے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے عرفات سے واپسی کے ذکر کے بعد اس جگہ سے واپسی کا حکم دیا ہے جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور فرمایا کہ ”تم بھی وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں“، ظاہر ہے کہ اس آیت میں عرفات سے واپسی کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس مقام (مزدلفہ) سے واپسی کا ذکر ہے جہاں جا کر واپسی ابھی باقی ہے، عرفات سے واپسی کا تو دن بھی گزر چکا، اب وہاں تو واپسی کے حکم کا کیا سوال!۔ (اور عرب جاہلیت کے قریش عرفات جانا اپنے لیے غیر مناسب سمجھتے تھے، پہلی تفسیر کے بنا پر زیر تفسیر آیت میں بھی عرفات سے ہی واپسی کا حکم ہو گا، حالانکہ یہ حکم گزر چکا ہے، اسے دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم پہلی تفسیر کو مرجوح قرار دیتے، لیکن مفسرین کا اس کی صحت پر اتفاق اور اس کی تائید میں احادیث کا تواتر

کے ساتھ نقل مانع ہے۔ (اور اسی لیے ہم نے کہا کہ ان آیات میں تقدیم ماحقہ التاخر کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ اس قاعدہ کے تحت پہلی تفسیر مضمون و ترتیب آیت کے مطابق ہو جاتی ہے)۔ یہ اعتراض صحیح نہیں ہو گا کہ ”الناس“، (لوگ) جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور براہیم علیہ السلام شخص واحد ہیں، کیونکہ اہل عرب اس طرح کا استعمال کرتے ہیں۔

”وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ ذکر ہو رہا تھا کہ جب عرفات سے منیٰ کی طرف واپس ہونے لگو تو ”مشعر حرام“ (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت اس طریقہ پر کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے اور جو براہیم علیہ السلام کے طریقہ کے مطابق ہے، اور پھر ارشاد ہے کہ ”اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں“ عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عرفہ کے دن میدان عرفہ میں (میں نے اللہ سے دعا کی کہ میری امت کے گناہوں کو معاف کر دے۔ ارشاد ہوا کہ میں نے معاف کیا، سوائے گناہوں اور مظالم کے جو مخلوق ایک دوسرے پر کرتی ہے۔ میں نے پھر دعا کی، لیکن قطعاً قبول نہیں ہوئی پھر مزدلفہ کی صبح کو میں نے دعا کی کہ اے رب! آپ اس پر قادر ہیں کہ مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ اپنی طرف سے دے دیں اور ظالم کو معاف کر دیں۔ ارشاد ہوا کہ میں نے یہ بھی معاف کر دیا۔ بیان کیا کہ اس پر حضور اکرم مسکرا دیئے۔ ہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! ابھی آپ تبسم فرما رہے تھے، حالانکہ یہ سنسنے کا دن نہیں ہے۔ آن حضور نے فرمایا کہ اللہ کے دشمن ابلیس پر مجھے ہنسی آگئی، جب اللہ کی قبولیت و مغفرت کو اس نے سنا تو داؤدیا مچانے لگا اور سر پر مٹی ڈالنے لگا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی حدیث نقل ہے۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد کے سلسلے میں معافی اور مظلوم کو اپنی طرف سے بدلہ دینے کا وعدہ مزدلفہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، اور یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”پھر تم بھی وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بے شک اللہ بڑے بخشنے والے، بڑے رحم کرنے والے ہیں“

فَإِذَا قُضِيَ مَنَاسِكُكُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ لِكَيْ تَرْكَبُوا أَبَاءَكُمْ وَأَوْشِدْ ذِكْرًا

پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (واجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو۔ بلکہ یہ ذکر اس سے

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي

(بدرجہا) بڑھ کر ہو۔ سو بعض آدمی (جو کافر ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو جو کچھ دینا ہو دنیا میں دیدیجئے اور ایسے شخص کو

الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ ۗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا

آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا اور بعض آدمی (جو کہ مؤمن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں

حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۗ أُولَٰئِكَ

بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیدیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے ایسے لوگوں کو

الذائف

لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ⑥

دو دنوں جہان میں، بڑا حصہ ملے گا بدولت ان کے عمل کے۔ اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں

اللہ کے نام اور اس کی عظمت کے ذکر سے سماں پیدا کر دے
”فَاِذَا قُضِيَتْ مِنْكُمْ اَبَاءُكُمْ اَوْ اَشْدَّ ذِكْرًا“ یعنی جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ

اور اپنی قربانی ذبح کر لو تو اللہ کی یاد کرو۔ فَشَاكًا، نَسِيكًا، مَنَسَاكًا، قربانی ذبح کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے بولتے ہیں ”نَسَاكَ الرَّجُلِ“ یعنی مرد نے اپنی قربانی ذبح کر دی۔ ”مَنَسَاكٌ“۔ مشرق، مغرب کی طرح اتم ہے۔ ہم نے ”مَنَسَاكٌ“ کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ مفسرین سے نقل ہے، مجاہد نے ”فَاِذَا قُضِيَتْ مِنْكُمْ اَبَاءُكُمْ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ مراد ”قربانی کرنا“ ہے۔

”وَفَاذَكَرُوا اللّٰهَ كَذَكَرَ كَمَا اَبَاءُكُمْ اَوْ اَشْدَّ ذِكْرًا“ کی تفسیر کئی طرح کی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ عرب حج سے فارغ ہونے کے بعد ایک جگہ جمع ہو جاتے اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر بیان کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ یہ جاہلی طریقہ تھا، اب اسلام میں شہداء، ذکرا اور تعظیم صرف اپنے رب کی کرو، اور خوب کرو جس طرح جاہلیت میں تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے اب اسی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، اللہ کا ذکر کرو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ عرب حج کے موقع پر اپنے آباء و اجداد کے مفاخر بیان کیا کرتے تھے، کوئی کہتا کہ میرے باپ کا دسترخوان بہت وسیع تھا، کوئی کہتا، میرا باپ شمشیر زنی میں ماہر تھا اور کوئی کہتا کہ میرے باپ نے فلاں قبیلہ کے سر کا بھیجا نکال لیا تھا۔ یہ تفسیر مجاہد، ابو داؤد، ابو بکر بن عیاش، قتادہ اور عکرمہ رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”پس تم اللہ کو یاد کرو جیسے نو عمر بچے اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں“ عطاء، ضحاک، ربیع اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ تفسیر منقول ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ ”تم اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ کو یاد کرتے ہو“ اس تفسیر میں کہا گیا ہے کہ عرب جاہلیت میں مشرکین حج کے اعمال پورے کرنے کے بعد منیٰ میں کھڑے ہو کر اللہ سے دعائیں کرتے تھے، اور دعا میں صرف اپنے باپ کا حوالہ دیتے تھے، دعا کے الفاظ کچھ یوں ہوتے کہ ”اے اللہ! میرا باپ بڑا بہادر، بڑا مالدار اور بڑے گروہ کا سردار تھا، مجھے بھی ایسا ہی بنا دے“ ارشاد ہے کہ دنیا کی طلب اور اپنے باپ دادا کا ذکر چھوڑ کر صرف اللہ کا ذکر کرو۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعمال حج سے فراغت کے بعد مومن بندوں کو طاعت و حضور کے ساتھ اپنے ذکر کا حکم دیا ہے، اس ذکر سے ممکن ہے وہی تکبیر و ذکر مراد ہو جس کا تذکرہ آیت ”پس اللہ کا ذکر چند گنے ہوئے دنوں میں کرو“ میں ہے۔ اس آیت میں بھی اعمال حج سے فراغت کے بعد ذکر اللہ کا حکم ہے۔ اس پر عمل کی ترغیب بیٹے کے باپ کے ذکر کی مثال سے دی، کہ جس طرح بیٹے اپنے باپ کا تذکرہ کرتے ہیں، اور جس کثرت سے کرتے ہیں اسی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تم اللہ کا ذکر کرو۔ اس تمثیل میں تفسیر اور

سپردگی کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے، یعنی جس طرح بچہ اپنے ماں باپ کے سامنے تضرع و زاری کرتا ہے تم اللہ کے حضور میں اس سے بھی زیادہ کرو، کیونکہ انھیں اور ان کے آباء و اجداد کو جو بھی نعمتیں میسر ہیں وہ سب اللہ کے فضل سے ہیں اور وہی ان کا مالک ہے۔ ہم نے اس رائے کو ممکنہ حد تک ترجیح اس لیے دی ہے کہ اعمال حج سے فراغت کے بعد اس تکبیر و ذکر کے سوا جو اللہ تعالیٰ نے منیٰ کے لیے خاص کیا ہے، اور کوئی ذکر باقی نہیں رہتا۔

”فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ“ یعنی اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ کرو جتنا اولاد اپنے باپ دادا کا کرتی ہے، اور آخرت اور دنیا کی بھلائیوں کے لیے اللہ ہی کی طرف رجوع کرو، اور اپنے تمام اعمال صرف اسی کی رضا جوئی کے مقصد سے کرو، اور کہا کرو کہ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے میں خریدی، اور ان کے تمام اعمال دنیا اور اس کی آرائش و زیبائش کی طلب کے لیے وقف ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے رب سے دنیا کے سوا اور کچھ نہیں مانگتے، ایسے لوگوں کا آخرت کی ان نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں جو اللہ نے اپنے اولیاء کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔ ابو وائل نے فرمایا کہ مراد وہ لوگ ہیں جو صرف طلب دنیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں بھیر، بکری دے، ہمیں اونٹ دے، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اس طرح کی دعا جاہلیت میں مشرکین کیا کرتے تھے۔ ابو بکر بن عیاش کی روایت میں ہے کہ مشرکین عرب اعمال حج سے فراغت کے بعد اس طرح کی دعا میں کرتے تھے کہ اے اللہ! ہمیں بکری دے، ہمیں اونٹ دے۔ اس کے متعلق آیت نازل ہوئی۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ عرب بیت اللہ کا طواف منگے ہو کر کیا کرتے تھے اور دعا یہ کرتے تھے کہ اے اللہ! بارش برس، ہمارے دشمن پر فتح عطا فرما۔ مجاہد، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی اسی کے مطابق تفسیر نقل ہے۔ سدی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ مشرکین منیٰ میں کھڑے ہو کر اس طرح کی دعائیں کرتے تھے۔ ابن زید کی روایت میں ہے کہ اس وقت تین گروہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی موجود تھی، دوسری طرف کفار تھے، اور تیسری طرف منافقین۔ زیر تفسیر آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہیں صرف دنیا مطلوب تھی، نہ آخرت کی فلاح وہ مانگتے تھے اور نہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ ایک جماعت وہ تھی جس کے متعلق اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے کہ وہ کہتی تھی کہ ”اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری دے اور آخرت میں بھی بہتری، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا“ اور تیسری جماعت ان لوگوں کی تھی جن کے متعلق ایک اور موقع پر ارشاد ہے کہ ”انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی بات دنیا کی زندگی کے بارے میں آپ کو اچھی معلوم ہوئی، لیکن وہ شدید ترین دشمن ہے“ (یعنی منافقین)۔ ”و خَلَّاقٍ“ کے مفہوم کے سلسلے میں تفصیلی بحث ہم کر چکے ہیں، اور اپنی اس رائے کو بھی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ لفظ ”حصہ“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

”وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ“۔ ”حَسَنَةً“

سے مراد کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد عافیت ہے، یعنی ”لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں عافیت عطا فرما اور آخرت میں عافیت عطا فرما، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچانا“، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ!

آخرت میں آپ کو جو کچھ بھی مجھے سزا دینی ہو وہ دنیا ہی میں دے لیجئے (اور عذابِ آخرت سے محفوظ رکھئے)۔ پچنانچہ وہ صاحبِ شدیدِ مرض میں مبتلا ہو کر صاحبِ فراش ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ان کا تذکرہ کیا تو اس حضور صہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ اس حضور سے عرض کی گئی کہ یہ صاحبِ اس طرح کی دعا کیا کرتے تھے: اے حضور! نے فرمایا کہ اللہ کی سزا کو برداشت کرنے کی کسی میں بھی طاقت نہیں، اس کے بجائے تم یہ دعا کیا کرو کہ ”اے ہا رسے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی عافیت دے اور آخرت میں بھی عافیت، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا، اب وہ صاحبِ یہ دعا کرنے لگے، اور چند ہی دنوں میں صحتیاب ہوئے۔ قتادہ نے فرمایا کہ ”حَسَنَةٌ“ سے مراد عافیت ہے۔ یہ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں ”حَسَنَةٌ“ سے مراد دنیا میں ”علم و عبادت“ ہے، اور آخرت میں ”جنت“ ہے۔ حسن اور سفیان ثوری رحمہما اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے دنیا میں ”علم اور پاک روزی“ منقول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ”حَسَنَةٌ“ سے دنیا میں ”مال“ اور آخرت میں ”جنت“ مراد ہے۔ ابن زید اور سدی سے یہی نقل ہے۔

میری رائے میں صحیح تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے گھر کا حج کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت میں ”حَسَنَةٌ“ مانگتے ہیں۔ یہ ایک وسیع لفظ ہے، جس میں جسمانی اور معاشی عافیت، روزی اور علم و عبادت سب ہی آجاتے ہیں۔ جہاں تک آخرت میں ”حَسَنَةٌ“ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد جنت ہے، کہ اس دن جسے جنت نہیں ملی وہ تمام حسنات سے محروم رہا اور عافیت کا اس کے قریب سے بھی گذر نہیں ہوا۔ ہم نے یہ تفسیر اس لیے پسند کی کہ اللہ تعالیٰ نے ”حَسَنَةٌ“ کو عام رکھا ہے اور کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی، پھر ہم اس میں کس بنیاد پر کوئی تخصیص کریں! ”وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ“ اور ”ہیں آگ کے عذاب سے بچا“ بولتے ہیں ”وَقِيْتُهُ كَذًا“ میں نے اسے فلاں چیز سے بچالیا۔ ”وَقَالَ اللَّهُ“ تمہیں اللہ تکلیف اور پریشانی سے محفوظ رکھے۔

”وَأُولَئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ“ (یہ وہ لوگ ہیں جنہیں حصہ مل کر رہے گا، اور ان کے لیے ہے، اور اللہ حساب بہت جلد لے لے گا۔ ”وَأُولَئِكَ“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اعمالِ حج کو مکمل کرنے کے بعد یہ دعا کرتے ہیں کہ ”اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بہتری و بھلائی عنایت فرمائیے اور آخرت میں بھی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچانا“ کیونکہ ان کی تمام تر امیدیں اور آرزوئیں اللہ تعالیٰ سے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ تمام خیر اللہ ہی کے پاس سے ملتی ہے اور سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے جو چاہتا ہے دیتا ہے۔ ارشاد ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حج اور اس کے مناسک کی ادائیگی پر بھرپور ثواب ملے گا، کہ یہ عمل انہوں نے اپنا مال خرچ کر کے اور اپنی جسمانی توانائیاں صرف کر کے انجام دیا ہے، لیکن ان کے مقابل وہ لوگ جو یہ سب کچھ خالص اللہ کے لیے، اس کے ثواب کی امید پر نہیں کرتے، بلکہ ان کے پیش نظر صرف دنیا اور اس کے فوائد ہوتے ہیں تو وہ نامراد و ناکام ہیں اور انہیں اللہ کے یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ یہ تفسیر قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے نقل ہے۔ ”وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ“ کا مطلب یہ ہے کہ اوپر مذکور دونوں فریق کے اعمال اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، دونوں کے مقاصد

اور نیتوں سے وہ خوب واقف ہے، ”وہ دونوں کا حساب بہت جلد لے لے گا“ اور پھر دونوں کو ان کے عمل و نیت کے مطابق بدلہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت ”معدودات“ لینے والا ذکر کیا، کیونکہ اللہ کے سامنے دنیا و ما فیہا کے ہر چیز کی تفصیلات ہیں، مخلوق کی طرح اس کے لیے سے شمار کرنے، سوچنے اور دیکھنے کی ضرورت نہیں، اس سے دنیا اور آسمان کی کوئی چیز چھپی نہیں، اور وہ اپنے اسی لامحدود علم کے مطابق بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اسی لیے اپنی صفت ”سَوِّیْعُ الْحِسَابِ“ بیان کی اور بندوں کو بتایا کہ اس میں بھی اس کی کوئی نظیر و مثل نہیں، وہ ہلک چھپکتے ہی سب کے حساب چکا دے گا، اسے اس کے لیے کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

وَأَذْكُرُ وَاللَّهُ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي

اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک۔ پھر جو شخص دو دن میں (رکھ واپس آئے میں)

يَوْمَ مَيِّتٍ فَلَا تَأْخِرُ عَلَيْهِ وَوَمَنْ تَأْخِرُ فَلَا تَأْخِرُ عَلَيْهِ

تعبیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں

لِمَنْ لَتَقُطُّ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَكُمْ

اس شخص کے واسطے جو (خدا سے) ڈرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے

إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ⑤

پاس جمع ہونا ہے۔

ایام حج میں اللہ کا ذکر

”وَأَذْكُرُ وَاللَّهُ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ“ یعنی اللہ کی یاد، اس کی توحید و عظمت کے ساتھ، چند گنے ہوئے دنوں میں کرتے رہو۔ مراد مہینی میں رمی جمار (کنکری پھینکنے)

کے دن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دنوں میں اپنے بندوں کو نماز کے بعد تکبیر کا حکم دیا ہے، اسی طرح کنکری پھینکنے وقت ہر کنکری پر تکبیر کا حکم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعدد روایتوں میں یہی قول نقل ہوا ہے کہ مراد ایام تشریق، قربانی کے دن کے بعد تین دن ہیں۔ عطار بن ابی رباح، مجاہد، ابراہیم حسن، اسماعیل بن ابی خالد، قتادہ، سدی، ربیع، مالک، ضیاک اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی یہ قول نقل ہے۔ ابن زید نے فرمایا کہ ”ایام معدودات“ سے مراد ایام تشریق

۱۵ مہینی کہ مظلہ سے شمال مغرب میں چار میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ایام تشریق ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱،

ہیں، اور ”ایام معلومات“ سے مراد عرفہ اور قربانی کے دن اور ایام تشریحی سب ہیں۔

ہماری اس تفسیر کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس کی متعدد اور مسلسل روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی دن ”اللہ کے ذکر کے دن“ ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایام تشریح کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ آپ سے ایک روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو منی میں یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا کہ ”ان دنوں میں کوئی روزہ نہ رکھے، کہ یہ کھانے پینے اور اللہ عزوجل کے ذکر کے دن ہیں“ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس مضمون کی حدیث مروی ہے۔ مسعود بن حکم زرقی اپنی والدہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان کیا، گویا میں علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ رہی ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کے سفید خچر پر سوار چلے آ رہے ہیں، آپ نے اپنی سواری شعب انصار کے پاس لا کر روک دی اور اعلان کیا کہ اے لوگو! یہ دن روزے کے دن نہیں ہیں، یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔ اگرچہ حضور اکرم ﷺ سے اس کی صراحت نہیں نقل ہے کہ یہ وہی ”ایام معدودات“ (گنے چنے دن) ہیں جن کا ذکر زیر تفسیر آیت میں ہوا ہے، اس لیے یہ شبہ ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ حدیث سے اشارہ ”ایام معلومات“ (معلوم و متعین دن) کی طرف کیوں نہ لیا جائے، کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر اللہ کا حکم دیا ہے، لیکن حدیث کو ”ایام معلومات“ کی تشریح قرار دینا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ ایام معلومات میں ذکر کا بیان قرآن مجید میں جس تفصیل سے آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ”ذکر“ سے مراد چوپایوں، قربانی کے جانوروں پر اللہ کا ذکر کرنا، ان کی قربانی کرتے وقت ہے۔ ارشاد ہے کہ ”لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ“ (تاکہ اپنے فوائد کے لیے آموجو وہیں اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیے ہیں)۔ اس آیت میں ایک خصوصیت

اور شرط کے ساتھ اللہ کے ذکر کا حکم ہے، لیکن زیر تفسیر آیت میں اس کے برخلاف حکم عام ہے، اور حدیث میں بھی ذکر اللہ کا عام ہی حکم ہے۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اس کے بجائے ”ایام معلومات“ کی طرف ہوتا تو آپ بھی حدیث میں شرط کا ذکر ضرور کرتے جو آیت میں مذکور ہے۔

”فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ“ (پس جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں) اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ ”پس اگر کوئی شخص دو ہی دن میں (۲) روزی الحجہ کو منی میں پہنچ کر ہمارے (کو) واپس چلا آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو دو ہی دن میں واپس نہ آجائے، بلکہ تین دن میں (۳) روزی الحجہ کو واپس آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ عطار، حسن، عکرمہ، مجاہد، سدی، قتادہ، ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کی روایت ہے۔ ایک قول یہ بھی آیت کی تفسیر میں نقل ہے کہ ”جو کوئی دو دنوں میں ہی جلدی کرے اسے معاف کر دیا جاتا ہے اور اس لیے اس پر اس کا کوئی گناہ نہیں، اور اسی طرح اسے بھی معاف کر دیا جاتا ہے جو تاخیر کرے“ عبد اللہ بن مسعود، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابراہیم، مجاہد اور معاویہ بن قرہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مجاہد رحمہم اللہ علیہ سے آیت کا ایک مفہوم بھی نقل ہے کہ آئندہ سال تک اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کے بجائے ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرے تو اس حج کے بعد تمام عمر اس پر کوئی گناہ نہیں، ایسے شخص کے تمام گناہ معاف

ہو جاتے ہیں۔ اس کی روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو العالیہ، ابن زید اور سدی سے ہے۔ ابن جریر نے بیان کیا کہ عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس کے بعد ہے کہ "لَمَنْ اتَّقَى اللَّهَ" (یہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتا رہی) آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ "جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے تو اس کے اس جلدی واپس آجانے میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ تیسرے دن کے ختم تک شکار مارنے سے پرہیز کرتا رہے، اور جو تاخیر کرے اور تیسرے دن واپس آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن ابی صالح سے اس تفسیر کی روایت ہے۔ ایک اور تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ آیت میں مذکورہ صورت میں کوئی گناہ نہیں، یعنی یہ معاف ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ حج میں ان اعمال سے پرہیز کرتا رہا، جن سے اللہ نے روکا ہے، اور اللہ سے ڈرتا رہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حج میں جن نے پرہیز گاری اور تقویٰ اختیار کیا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

ان تمام اقوال میں راجح تفسیر یہ ہے کہ "جو شخص ان دو دنوں میں جلدی کرے یعنی منیٰ کے سہ روزہ قیام میں دوپہن میں واپس آگیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یعنی اگر وہ حج میں اللہ سے ڈرتا رہا اور ان تمام امور سے پرہیز کیا جن سے پرہیز کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور وہ تمام اعمال پورے آداب و حدود کے ساتھ بجالایا جن کے بجالانے کا اللہ نے حکم دیا ہے تو اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا۔ اسی طرح جو تیسرے دن واپس آئے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اگر اس نے تقویٰ و پرہیز گاری کے ساتھ حج کیا ہے تو اللہ اس کے بھی تمام گناہ معاف کر دے گا" ہم نے یہ تفسیر اس لیے پسند کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں، جن کی روایات بتواتر ہم تک پہنچی ہیں، یہ ارشاد موجود ہے کہ "جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا، اور اس میں نہ فحش کلامی کی اور نہ بے حکمی کی تو وہ اپنے گناہوں سے نوبل و نچے کی طرح پاک ہو جاتا ہے" اور یہ کہ حج و عمرہ مسلسل کرتے رہو، کیونکہ ان سے گناہ اس طرح چھٹ جاتے ہیں جیسے بھٹی سے لوسہ، سونے اور چاندی کا میل چھٹ جاتا ہے۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حج اور عمرہ مسلسل کرتے رہو کیونکہ یہ محتاجی اور گناہ کو دور کر دیتے ہیں، جیسے بھٹی میں پڑ کر لوسہ، سونے اور چاندی کا میل دور ہو جاتا ہے، اور مبرور و مقبول حج کا جنت سے کم کوئی ثواب نہیں" عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس مضمون کی حدیث نقل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم نے حج پورا کر لیا تو نوبل و نچے کی طرح گناہ سے پاک ہو گے۔ اس مضمون کی احادیث بکثرت ہیں، ہم ان سب کو یہاں ذکر کر کے بحث کو طول دینا نہیں چاہتے۔ ان تمام احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس نے حج کیا اور اس کی ادائیگی ان تمام حدود و آداب کے ساتھ کی جن کا اللہ نے حکم دیا ہے تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ "فَلَا تَلْمِزُوا عَابِدًا لَمَنِ اتَّقَى اللَّهَ" یعنی جو اپنے حج میں اللہ سے ڈرتا رہا تو اس کے کوئی گناہ نہیں۔

"وَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ" یعنی اے مومنو! اللہ نے جو امور تم پر فرض کیے ہیں ان میں کمی زیادتی کرنے، جن سے اس نے تمہیں حج میں روکا ہے ان کا ارتکاب کرنے اور جن کا حکم دیا ہے انہیں نہ بجالانے میں "اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے" اور اس وقت وہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ

اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزے دار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ

اللَّهُ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ ۗ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۹ وَإِذَا تَوَلَّىٰ

کو حاضر ناظر بتاتا ہے اپنے مافی الضمیر پر حالانکہ وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے اور جب پیٹھ پھیرتا ہے

سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ

تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور (کسی کے) کھیت یا مویشی کو تلف کر دے۔

وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۝۱۰ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ

اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ خدا کا خوف کر تو سخت اس کو گناہ پر (دونا)

بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۗ وَلَبِئْسَ الْبِهَادُ ۝۱۱ وَمِنَ

آبادہ کر دیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی ٹھکانہ ہے اور بعض

النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ

آدمی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے

وَاللَّهُ رَعُوفٌ بِالْعِبَادِ ۝۱۲

اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں

طبقہ منافقین کا ذکر

بعض ایسے بھی ہیں جن کی گفتگو اور ظاہر آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے، اور جو ان کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بنا لیتے ہیں، حالانکہ وہ شدید ترین دشمن ہیں، مفسرین کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ بعض مفسرین کی رائے ہے کہ احنس بن شریق ثقفی کے بارے میں نازل ہوئی، یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام کا اظہار کرتے ہوئے آیا اور قسم کھا کھا کر کہا کہ آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں، لیکن واپسی میں مسلمانوں کے مال و جان واد کو تباہ کرتا ہوا گیا۔ سدی بیان کرتے ہیں کہ شخص حضور اکرم کی خدمت میں بدینہ حاضر ہوا اور اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضور اکرم کو اس کی باتیں بہت پسند آئیں۔ اس نے کہا کہ میرا مقصد اسلام کے سوا اور کچھ نہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں صرف اسی غرض سے آیا ہوں۔ اسی کے متعلق آیت میں ارشاد ہے کہ ”اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بنا لیتا ہے“ پھر جب واپس ہوا تو مسلمانوں کے ایک کھیت سے، جہاں گدے بھی تھے، گذرتے ہوئے کھیتی

کو جلا دیا اور گدھوں کی نسیں کاٹ دیں۔ اسی کا بیان اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ ”اور جب بیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوزخ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے اور کھیتی اور نسل کو تلف کرے“ ”أَلَا الْإِنْحِصَامُ“ یعنی شدید ترین دشمن۔ اسی سلسلہ میں آیات ”وَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ هُمْ مَنذَرَةٌ لِّمَنذَرَةٍ“ اور ”لَا تَطْعَمُ كُلُّ جَلَاظٍ مَّهْمِينَ“ بھی نازل ہوئیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جنہوں نے اپنی نجی مجلس میں غزوہ ریح پر نکتہ چینی کی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خبیث رضی اللہ عنہ کے ساتھی مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام ریح میں شہید کر دیئے گئے تو بعض منافقین نے کہا کہ ان مقتولوں کا معاملہ بھی قابل افسوس ہے، ان سے اپنے گھروں میں بھی نہ بیٹھا گیا اور نہ اپنے ساتھی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام ہی پہنچا سکے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی باتیں آپ کو دنیاوی زندگی کے سلسلے میں اچھی معلوم ہوتی ہیں، وہ آپ کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، لیکن وہ شدید ترین دشمن ہیں، اور زمین پر فساد پھیلاتے پھرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جانوں کو بیچ دیا ہے، انہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہاں تک کہ شہادت پائی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مراد تمام منافقین ہیں، اور آیت میں ان کے ظاہر و باطن کے اختلاف کو بتایا گیا ہے۔ محمد بن کعب اور سعید مقبری رحمہما اللہ آپس میں بعض مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ سعید نے فرمایا کہ بعض آسمانی کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کی زبانیں شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہیں، لیکن ان کے دل ایلوہ کے زیادہ کڑوے ہیں، جو ان کے لیے انہوں نے نرمی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، لیکن وہ دین کے بدلے میں دنیا کے خریدار ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے متعلق ارشاد ہے کیا یہ لوگ مجھ پر جرات کرتے ہیں، اور میرے ساتھ دھوکا کرتے ہیں! میری عزت کی قسم، میں ان پر ایک ایسا فتنہ بھیجوں گا کہ ان میں کانہایت بردبار اور تحمل المزاج بھی آتش زیر پا ہو جائے گا۔ محمد بن کعب نے اس پر کہا کہ یہ تو قرآن مجید میں بھی ہے۔ سعید نے پوچھا کہ قرآن مجید کی کس آیت میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے؟ تو آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ سعید نے فرمایا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ آیت کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی! محمد بن کعب نے فرمایا کہ آیت اگرچہ نازل خاص واقعہ اور خاص شخص کے بارے میں ہو، لیکن اس کا حکم عام ہوتا ہے۔ نوٹ جو کچھ امتوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، ان سے سعید قرظی کا اسی مضمون کا ایک مذاکرہ دوسری روایت میں نقل ہوا ہے۔ قتادہ، مجاہد، ربیع اور عطاء رحمہم اللہ سے بھی یہی نقل ہے کہ آیت سے مراد منافقین ہیں۔ ربیع نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا، عمل اس کے بہت بُرے تھے، لیکن زبان میں بڑی مٹھاس تھی اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ”وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ“ کی قرأت دو طرح کی گئی ہے۔ ایک تو یہی عام اور مشہور قرأت (اللہ کے فتح کے ساتھ)، یعنی منافق اپنے دل کی بات پر اللہ کو گواہ بناتا ہے کہ وہ جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہی اس کے دل میں بھی ہے، اور یہ کہ وہ واقعی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے، حالانکہ وہ جھوٹا ہے۔ ابن زید نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور کہتا کہ اے اللہ کے رسول، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے پاس سے حق اور سچائی لے کر جوت ہوئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے۔ وہ شخص یہ بھی کہتا کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، یا رسول اللہ!

خدا کی قسم، جو کچھ میں زبان سے کہتا ہوں وہی میرے دل میں ہے۔ بیان کیا کہ اس طرح کی باتیں کرنے والے منافقین تھے۔ آپ نے اس کے ثبوت میں یہ آیت پڑھی ”جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں“ یعنی جو یہ اللہ کو گواہ بناتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس دعوے میں یہ جھوٹے ہیں۔ سدی نے ”وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ“ کی تفسیر میں بھی یہی فرمایا کہ ”وہ کہتے تھے کہ اللہ جانتا ہے کہ ہم سچے ہیں، ہمارا مقصد صرف اسلام ہے“، مجاہد سے بھی یہی تفسیر نقل ہے۔

دوسری قرارت اس کی یہ ہے کہ ”وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ“ اللہ کے ضمہ کے ساتھ یعنی اللہ گواہی دیتا ہے اس کی جو ان کے دل میں نفاق چھپا ہوا ہے، اور یہ کہ زبان سے یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دل کی بات کے بالکل مخالف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر بھی اسی قرارت کی بنیاد پر ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک صحیح قرارت پہلی ہی ہے، کیونکہ اسی پر سب کا اتفاق ہے۔

”وَهُوَ اللَّهُ الْخَصَّامُ“۔ ”اللَّهُ“ سخت، حجت باز شخص کو کہتے ہیں۔ لغت عرب سے یہی معنی ثابت ہے۔ مفسرین کے اس کی تفسیر کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ ایک تفسیر میں اس کا مفہوم ”جھگڑالو“ بتایا گیا ہے! ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے“، یعنی گفتگو میں معمولی باتوں پر جھگڑے لڑائی پر اتر آتا ہی قنادہ نے فرمایا کہ ”اللہ کی معصیت میں سخت دل، ناحق پر جھگڑنے والا، دیکھنے میں بڑا چرب زبان، لیکن عمل میں نرا جاہل، باتیں حکمت آمیز کرتا ہے لیکن خود ہمیشہ غلط روش اختیار کرتا ہے“ دوسری تفسیر یہ ہے کہ بحث میں کبھی سلیم الطبعی کا ثبوت نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ کج روی اختیار کرتا ہے۔ مجاہد اور سدی رحمہما اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے لیکن ان دونوں تفسیروں کا منشاء و مقصد ایک ہی ہے، کیونکہ کج روی ہی کو جھگڑالو پن کا پیش خیمہ ہے۔

ایک قول اس کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ ”حالانکہ وہ جھوٹا ہے“ چنانچہ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”وَاللَّهُ الْخَصَّامُ“ یعنی ”کاذب“ (جھوٹا) ہے۔ لفظ کا یہ اصل مفہوم تو نہیں ہے، لیکن غالباً اس نقطہ نظر سے یہ تفسیر کی گئی ہے کہ آیت کا مقصد یہی ہے۔ ”خصام“ مصدر ہے، جھگڑا اور دشمنی کے معنی میں۔ آیت میں منافقین کے بارے میں اطلاع دی گئی ہے۔ کہ منافق کی باتیں آپ کو بھی معلوم ہوتی ہیں، اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بھی بناتا ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے وہی کہہ رہا ہے لیکن یہ سب کچھ اس کی چرب زبانی ہے، باطل اور جھوٹ کو صحیح ثابت کرنے کا فن اسے خوب آتا ہے۔

”وَرَأَى الْتَوَلَّى سَعْيِي فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا“ یعنی اے محمد! یہی منافق جب بیٹھ پھیرتا ہے، آپ کے یہاں سے واپس جاتا ہے (تو اس دور و صوب میں لگ جاتا ہے کہ زمین پر فساد کرے)۔ ”تَوَلَّى“ کا یہی مفہوم یعنی جب آپ کے یہاں سے واپس جاتا ہے ”ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے لیکن بعض حضرات نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ”جب وہ غصہ ہوتا ہے“ ابن جریر سے یہ مفہوم نقل ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ”جب یہ منافق آپ کے پاس سے غصہ ہو کر نکلتا ہے تو زمین پر فساد کرتا ہے اور وہ اعمال کرتا ہے جو اللہ نے حرام کیے ہیں، جیسا کہ ہم نے سدی کا قول بیان کیا تھا کہ انفس بن شریح نقی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس نے بظاہر اسلام کا اظہار کیا تھا، لیکن مسلمانوں کے کھیت تباہ کر ڈالے تھے اور ان کے گدھے مار ڈالے تھے“۔

کلام عرب میں "عمل" کے معنی میں آتا ہے، یعنی کسی کام کے لیے کوشش اور دوڑ دھوپ تاکہ اس کا پھل لے سکیں، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔

آیت میں مذکور منافق کی طرف منسوب جس فساد کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اس کی تفصیل میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں ایک قول تو وہی ہے جو ہم پہلے اخلس بن شریق کے طرز عمل کے سلسلے میں بیان کر چکے ہیں، یعنی ڈاکہ زنی اور راستہ میں خوف و ہراس پیدا کرنا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "زمین پر فساد" سے مراد صلہ رحمی نہ کرنا اور مسلمانوں کا خون بہانا ہے۔ یہ قول ابن جریر سے نقل ہے۔ لیکن آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس منافق کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے واپس جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے" اس میں تمام ہی گناہ آجاتے ہیں، کیونکہ اللہ کی نافرمانی زمین پر فساد کے مرادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر فساد کی کوئی خاص صورت نہیں بیان کی ہے، اس لیے ڈاکہ زنی اور راستہ کو غیر محفوظ بنانا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اس کے علاوہ دوسرے تمام گناہ بھی اس میں داخل ہیں۔ البتہ زیر تفسیر آیت میں، سیاق و سباق سے زیادہ قرین قیاس ہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد ڈاکہ زنی، اور راستہ کو غیر محفوظ بنا دینا ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ اور کھیتی اور نسل کو تلف کرے" یہی ڈاکہ زنی ہے۔

"وَيُهْلِكُ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ" (اور کھیتی اور نسل کو ہلاک کرے) یہ منافق کھیتی اور نسل کو کس طرح "ہلاک" کرتا ہے؟ بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس کی صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے کھیتوں کو اس نے جلا ڈالا تھا اور ان کے گدھے کاٹ ڈالے تھے۔ اس کی سدی سے روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ "جب یہ منافق پٹھ پھرتا ہے تو ظلم اور سرکشی کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش رکھ لیتا ہے اور "کھیتی اور نسل ہلاک ہو جاتی ہے" مجاہد نے ثبوت میں اس آیت کی تلاوت کی "فساد بر و بکر میں پھیل پڑا ہے، ان اعمال کی وجہ سے جو لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے کمانے، تاکہ اللہ انھیں ان کے بعض اعمال کا بدلہ دے، تاکہ وہ باز آجائیں" پھر آپ نے فرمایا کہ "خدا گواہ ہے، بحر سمندر سے مراد اس کا معروف و مشہور مفہوم ہی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ گاؤں بھی ہے جو کسی بہتے ہوئے نلے کے کنارے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی اس تفسیر کے لیے اگرچہ آیت میں گجائش ضرور ہے، لیکن صحیح تفسیر وہی ہے جو سدی رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے نقل کی۔ "الْحَرْثُ" سے مراد کھیتی ہے، اور "النَّسْلُ" سے مراد نسل، بعد میں آنے والی اولاد ہے، "کھیتی کی ہلاکت"، سے مراد اسے جلا دینا ہے، "نسل کی ہلاکت"، سے مراد یہ ہے کہ جن سے نسل چلتی ہے یعنی ماں، باپ۔ زیادہ انھیں مار ڈالتا ہے۔

ہماری رائے میں راجح تفسیر سدی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، البتہ انھوں نے اپنی تفسیر میں ایک خاص واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک منافق نے مسلمانوں کے گدھے مار ڈالے تھے اور ان کی کھیتی جلا ڈالی تھی۔ ایسا ہی ہوگا، لیکن اس میں کیا حرج ہے کہ آیت کا مفہوم عام رکھا جائے، یعنی جو بھی کھیتوں کو جلاتا ہے اور نسل کشی کا مرتکب ہے وہ اس کے حکم میں داخل ہے اللہ تعالیٰ نے بھی آیت کے الفاظ عام ہمارے رکھے ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس میں کسی خاص واقعہ کی وجہ سے تنگی کی جائے ہماری اس رائے کی تائید مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے اقوال سے ہوتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

”حزبت“ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جنہیں تم بولتے ہیں اور نَسَل سے مراد ہر طرح کے چوپایہ کی نسل ہے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ نسل میں صرف چوپائے اور جانوری نہیں آتے، بلکہ انسان بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس مضمون کی روایت ضحاک، ربیع، عطار اور سعید بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی ہے۔ ”وَاللّٰهُ لَا يَجِبُ الْفَسَادَ“ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا، فساد سے مراد معصیت، ڈاکہ زنی اور راستہ کو غیر مومن بنا دینا ہے۔ ”فَسَادَ“ مصدر ہے۔

”وَاِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْاِهْلَاقُ“ اسی منافق کا ذکر ہے جس کے اوصاف ابھی بیان ہوئے، یعنی ”جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرا اور زمین پر فساد کرنا بند کر دے تو اس کی نجات وغرور سے اللہ کی معصیت اور نافرمانی پر اور زیادہ آمادہ کر دیتا ہے، اور وہ بڑھ چڑھ کر فساد پھیلانے لگ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کی اس گمراہی کے بدلے میں اس کے لیے جہنم ہی بس ہے، اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت سے مراد ہر منافق و فاسق ہے (جو مخلصانہ نصیحت پر اور زیادہ آمادہ نافرمانی ہو جاتا ہے) یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی ان صالحین کا تذکرہ ہے جو اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتے ہیں، یعنی جب اس گروہ کا کوئی شخص کسی منافق کو نصیحت کرتا ہے، اور اس کی معقول نصیحت منافق کو اور زیادہ آمادہ نافرمانی کر دیتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی جان بھی اللہ کی رضا جوئی کے لیے بیچ دی ہے، چنانچہ وہ اس معاملہ میں لڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ تفسیر علی، عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل ہے۔ آیت کی دوسری تفسیر وہی ہے جس کی تفصیل اس سے پہلے آچکی ہے کہ مراد افسوس بن شریک منافق ہے۔ ”وَلَبِئْسَ الْاِهْلَاقُ“ یعنی جہنم کیا ہی بری آرام گاہ ہے، جس کی وعید اللہ تعالیٰ نے اس منافق کو دی ہے۔ ”وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ“ یعنی ”اور کوئی ایسا بھی ہے جو اپنی جان تک اس کے عوض میں بیچ دیتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ

اور جو رضائے الہی کے طالب ہیں

نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے، یہی مضمون ایک موقع پر یوں بیان ہوا ہے ”بلاشبہ اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور ان کے مال اس عوض میں خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے۔“ ”رَبِّتَغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ“ یعنی ”اللہ کی رضا جوئی میں“ یعنی یہ بیچنے والا اپنے آپ کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے بیچ ڈالتا ہے۔

آیت کے شان نزول کے بارے میں مفسرین سے مختلف اقوال نقل ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آیت مہاجرین اور انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی، اور آیت سے مراد اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہیں۔ عکرمہ سے روایت ہے کہ آیت صہیب بن سنان اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو آپ کے گھر والوں نے پکڑ لیا تو آپ بھاگ کر آں حضور کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پھر جب آپ ہجرت کے ارادہ سے نکلے تو راستہ میں مر الظہران کے مقام پر جہاں آپ کے قبیلہ کا قیام تھا، انھوں نے آپ کو پکڑ کر لیا، لیکن آپ نے وہاں بھی ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ صہیب رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر والوں نے پکڑ لیا اور قید کر دیا۔ لیکن آپ نے اپنا بیت سماں انھیں دیکر اپنے کو آزاد کر لیا۔ جب آپ ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو راستہ میں متقذ بن عمیر نے آپ کو پکڑ لیا، اور جو چھ مال و اسباب باقی رہ گیا تھا وہ بھی اس کے حوالہ کر دینا پڑا اور اس طرح اس سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ ربیع سے بھی اسی مضمون کی روایت ہے کہ ایک مہاجر کو ہجرت کرتے وقت اسی طرح کے مصائب سے جن میں ان کا تمام مال و اسباب چھن گیا تھا دو چار ہونا پڑا تھا، اور انھیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت سے مراد نہ وہ شخص ہے جو اللہ کی طاعت، اس کے راستے میں جہاد اور امر بالمعروف میں اپنی جان تک کی پروا نہ کرے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر بھیجا۔ مسلمانوں کے لشکر نے دشمن کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد قبیلہ بھیلہ کے ایک شخص نے آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کر دیا اور شہید کر دیئے گئے۔ لوگوں نے ان کے بارے میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنی جان دی۔ جب عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے ”اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتا ہے“۔ قتادہ روایت کرتے ہیں کہ ہشام بن عامر نے دشمن کی صف پر حملہ کر کے ان کی صفیں کی صفیں الٹ دیں تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہی آیت تلاوت کی۔ حسن نے فرمایا کہ وہ مسلمان مراد ہے جو کافر سے لڑا اور شہید کیا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوا شہید کیا گیا وہ اس آیت سے مراد ہے۔ آیت کی یہی تفسیر بہتر اور راجح ہے، جو عمر بن خطاب علی بن ابی طالب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل ہے کہ ہر اچھی بات کی لوگوں کو نصیحت کرنے والا (امر بالمعروف) اور بری باتوں سے روکنے والا (نہی عن المنکر) مراد ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں دو فریقوں کا ذکر کیا ہے، ایک منافق جس کے ظاہر اور باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے، جو زمین پر فساد کرتا ہے اور جب اسے مخلصانہ نصیحت کی جاتی ہے تو اس کی نخوت اسے اور زیادہ آمادہ گناہ کرتی ہے۔ اس کے بالمقابل دوسرا شخص ہے مومن مخلص، جس نے اپنی جان تک اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالی ہے۔ اگر اس دوسرے فریق کو پہلے کے مقابل میں رکھا جائے تو مفہوم یہی ہو گا کہ جس نے اپنی جان اللہ کے راستے میں بیچ ڈالی ہے، اس نے اسی طرح کے کسی فاسق و منافق سے مقابلہ کے وقت سچی ہے اور اس کے مقابلہ میں شہید کیا گیا۔ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ صہیب رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی، کسی خاص واقعہ اور شخص کے بارے میں آیت نازل ہونے کے باوجود حکم عام ہو سکتا ہے، اور اس کے تمام نظائر اس کے حکم کے تحت آسکتے ہیں۔

”وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ“ (اور اللہ بندوں کے حق میں بڑا شفیق ہے) ”رَأْفَةٌ“ کا مفہوم ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہاں مراد ”شفقت و مہربانی“ ہے یعنی جس بندے نے اللہ کی رضا جوئی اور اس کے راستے میں جہاد کے لیے اپنی جان تک بیچ ڈالی اس پر اللہ بڑا ہی مہربان اور شفیق ہے، اسے اپنے راستے میں مصائب آزمائشوں کا اللہ پورا پورا بدلہ دے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو۔ اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان

خطوات الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ فَإِنْ زَلَلْتُمْ

کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے پھر اگر تم بعد اس کے کہ

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

تم کو واضح دلیلیں پہنچ چکی ہیں (صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین کر رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے)

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۱۳﴾

زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

ایمان لائے ہو تو پوری طرح سے اپنالو "سَلَّمَ" کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین سے کئی اقوال نقل

ہیں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے یہاں مراد "اسلام" ہے، یعنی "لے" وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ، سدی، ابن زید اور ضحاک رحمہم اللہ سے یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ مراد "طاعت" ہے، یعنی لے ایمان والو، طاعت میں پوری طرح داخل ہو جاؤ۔ "زیغ" سے اس معنی کی روایت ہے۔

عام اہل حجاز کی قرأت "سَلَّمَ" سین کے فتح کے ساتھ ہے، اور مراد "صلح، مصالحت" لیتے ہیں۔ جن حضرات نے اس کی قرأت سین کے کسرہ کے ساتھ کی ہے، ان میں کئی بعض نے اس سے مراد صلح ہی لیا ہے لیکن میری رائے میں راجح تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے اور یہ سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جب قبیلہ کذہ کے بہت سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تو اس سلسلے میں انھیں کے ایک فرد کا یہ شعر ہے

دَعَوْتُ عَشِيرَتِي لِلْإِسْلَامِ لَسَمًا
رَأَيْتَهُمْ تَوَلَّوْا مُدْبِرِينَا

یہاں بھی "السلم" سین کے کسرہ ہی کے ساتھ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب میرے قبیلہ نے ردگردانی کی اور مرتد ہو گئے تو میں نے انھیں اسلام، کی طرف بلایا۔

ابو عمرو بن علاء رحمہ اللہ قرآن مجید کی تمام دوسری آیتوں میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے "سَلَّمَ" سین کے فتح کے ساتھ پڑھتے تھے، صرف سورۃ بقرہ کی اس آیت میں سین کو کسرہ پڑھتے، اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سین کو کسرہ پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں پر اس کا معنی "اسلام" ہی ان کے نزدیک صحیح تھا۔ ہم نے بھی یہی تفسیر اس آیت کی پسند کی کہ آیت کے مخاطب مومن ہیں (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا) اب اگر اس سے وہ مومنین مراد لیے جائیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تصدیق کی تھی تو ان کے ساتھ صلح اور ترک جنگ کی دعوت کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا، جنگ تو دشمنوں سے ہوتی ہے اور جن سے جنگ کے امکانات ہوں انھیں کے ساتھ صلح کی بھی کوئی صورت پیدا کی جانی ممکن ہے، جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ حضور اکرم کی جماعت کے فرد بن چکے ہیں، انھیں صلح اور ترک جنگ کی دعوت کا آخر کیا مفہوم ہو سکتا ہے! اس کی ایک اور صورت یہ ہے کہ آیت کا خطاب ان مومنوں سے ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کی شریعت کی تصدیق کرتے ہوں، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نبوت سے انھیں انکار ہو۔ اس صورت میں بھی "سَلَّمَ" سے مراد اسلام کے سوا کوئی اور دوسرا

مفہوم نہیں ہو سکتا، یعنی اسے پچھلے تمام انبیاء پر ایمان لانے والو، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر بھی ایمان لاؤ۔ دعوت انھیں بھی اسلام ہی کی ہو سکتی ہے، صلح کی دعوت کا یہاں بھی کوئی مفہوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے اوپر، اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اور اسی کی دعوت دی گئی ہے، معاملات اور صلح کی دعوت نہیں دی گئی، صلح کی دعوت تو حالات پر موقوف ہے، بعض حالات میں اس حضور کو اس سے روکا بھی گیا ہے، ایک موقع پر ارشاد ہے کہ "فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون وادله معكم" سو تم ہمت مت ہارو اور انھیں صلح کی طرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے" لیکن بعض حالات میں اس کی اجازت دی گئی ہے، یعنی اگر کفار بھی صلح پر مائل ہوں تو تمہیں بھی اس کے لیے سلسلہ جنبانی کہنی چاہیے، مثلاً ارشاد ہے "اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ بھی اس طرف جھک جائیں، بنیاد طور پر، اور حالات کا لحاظ کیے بغیر صلح کی عام دعوت قرآن مجید میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

اب یہاں پر علماء کے اقوال مختلف ہو گئے ہیں کہ آیت میں "مؤمنون" سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ہیں یا صرف آپ سے پہلے کے انبیاء پر ایمان لانے والے مراد ہیں۔ جن مفسرین کی یہ رائے ہے کہ وہ مؤمنین مراد ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لانے تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں انھیں شریعت کے ایک ایک جز پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی شریعت کے تمام احکام، تمام حدود پر بلا کسی تخصیص کے عمل کرو، ایسا نہ ہونے پائے کہ بعض پر تو عمل کرو اور بعض کو نظر انداز کر دو۔ اس صورت میں "حکافۃ" سلمہ کی صفت ہوگا، اور مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ لے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والو، پوری شریعت اسلامی پر، بلا کسی کوتاہی و کمی کے، عمل کرو، اور اس کے کسی جز کو بھی نہ چھوڑو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تفسیر نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آیت ثنابہ، عبداللہ بن سلام، ابن یامین، اسید، شیبہ بن عمرو اور قیس بن زید کے بارے میں نازل ہوئی تھی، یہ سب حضرات یہودی تھے، اسلام لانے کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! سبت (سینچر) کے دن کی ہم تعظیم کیا کرتے تھے، ہمیں اب بھی سبت منانے کی اجازت دیجئے، تو رات بھی اللہ کی کتاب ہے، اس لیے رات کی نماز میں ہمیں اس کے پڑھنے کی بھی اجازت عنایت فرمائیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت میں بصراحت موجود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان ایمان لانے والوں کو اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے جو اس آخری شریعت میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کرنا چاہتے تھے، انھیں حکم ہوا ہے کہ تمام دوسرے احکام کو، جن کا حکم اسلام میں نہیں ہے، چھوڑ کر بنام کمال اس آخری شریعت پر عمل کریں، اور اس میں کوئی کمی زیادتی نہ کریں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اس آیت میں پوری طرح اسلام میں داخل ہونے والے، حکم ان اہل کتاب کو ہے جو پچھلے انبیاء پر تو ایمان رکھتے تھے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی شریعت کا انکار کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک سے روایت ہے کہ آیت کے مخاطب اہل کتاب ہیں۔ میری رائے میں صحیح تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لانے والوں اور ان اہل کتاب کو جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے، لیکن آپ سے پہلے کے انبیاء پر ایمان رکھتے تھے، سب کو اس کا حکم

دیا ہے کہ وہ اس آخری شریعت، شریعت اسلام، پر تمام و کمال عمل کریں، اور اس پر عمل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، جو بھی ایمان والا ہے وہ اس کا مخاطب ہے، اس لیے ہمیں بھی اس کے مفہوم میں تخصیص نہ کرنی چاہیے۔ مجاہد نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ”اسلام میں، اس کے تمام احکام پر عمل کے ساتھ پوری طرح آجاؤ۔“ کافۃً، یعنی ”عام، سب“ ہے۔ یہ معنی ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، سدیی، مجاہد، ابن زید اور ضحاک رحمہم اللہ سے نقل ہے۔

”وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ“ اہل ایمان کو حکم تھا کہ کل شریعت اسلامی پر عمل کرو اور عمل اور قول سے اس آخری دین کے ایک ایک جز کی تصدیق کرو۔ اسی سلسلہ میں ارشاد ہے کہ ”اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“ وہ شیطان کے نقش قدم سے مراد وہ تمام راستے ہیں جو اسلام کے احکام کے خلاف ہیں۔ اس میں دوسری تمام ملتوں اور شریعتوں کے احکام و اعمال آگے جو شریعت اسلامی سے جوڑ نہیں کھاتے۔

”فَإِنْ زُلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ“ یعنی پھر اگر تم ڈگمگائے، حق سے ہٹ گئے اور شریعت اسلامی کے خلاف کیا، اس کے بعد کہ تمہارے پاس میری طرف سے واضح نشانیاں اور دلائل آچکے اور شریعت اسلامی کی صحت دلائل کی روشنی میں قطعی ہو چکی، تو اے مومنو! جان لو کہ اللہ بڑا زبردست اور غلبہ والا ہے، اور تمہیں سزا دینے سے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی، اور وہ بڑا حکمت والا ہے، قطعی اور واضح دلائل اور نشانیوں کے باوجود اس کے حکم کی مخالفت پر سزا دینا عین حکمت ہے۔ کئی مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں ”بیّنات“ (نشانیوں) سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید ہے۔ یہ رائے بھی ہماری تفسیر سے قریب ہے، کیونکہ ان آیتوں میں حضور اکرم اور قرآن مجید ہی کے ذریعہ انھیں خطاب کیا گیا ہے، لیکن ہماری تفسیر زیادہ موزوں ہے، کیونکہ اہل کتاب کے علماء کے لیے ان کی آسمانی کتابیں تورات و انجیل کی وہ آیتیں اور انبیاء کی وہ وصیتیں بھی واضح نشانیاں تھیں جن میں ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لیے وعدہ لیا گیا تھا یا آپ کے اوصاف کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل تھے، اور اس کے ساتھ خود اللہ کی پاک، کھلی ہوئی زندگی اور قرآن مجید اور اس کا اعجاز بھی واضح نشانیاں ہیں۔ ہماری رائے کی تائید ابن عباس نے فرمائی ہے، ابن جریر اور ربیع رحمہم اللہ کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔

ہونا ہے

کے دن تم

ہوگا، بلکہ

گے۔

تھا تم آہ و بکا

جملہ ہو جائے۔

ہو سکتا ہے!

رہے گفتگو فرمائی!

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَوَابِ مِّنَ السَّمَاءِ وَرِجَالُهُ يَأْتِيهِمْ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ
 (سزا دینے کے لیے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے اور یہ سارے مقدمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے

سَلُّ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا تَتِيمُهُمْ مِنْ آيَةِ بَيْتِهِ

آپ (علماء) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھیے (تو سہی) ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں

وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے اس کے پاس پہنچنے کے بعد۔ تو یقیناً حق تعالیٰ

شَدِيدُ الْعِقَابِ

سخت سزا دیتے ہیں

کیا قیامت کا انتظار ہے!

”هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تکذیب و انکار کرنے

والوں سے ہے، یعنی ”ان لوگوں کو سوا اس کے اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ اللہ ان کے پاس بادل کے سائبانوں

میں آجائے اور فرشتے (بھی)۔“ ”الْمَلَائِكَةُ“ کو بعض حضرات رفع پڑھتے ہیں، اور ”اللَّهُ“ پر اس کا خط مور

کرتے ہیں۔ یعنی کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنے فرشتوں کو ساتھ لے کر، بادل کے سائبانوں میں

ان کے پاس آجائے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ”فرشتے باد

کے سائبانوں میں آئیں، اور اللہ تعالیٰ جس میں چاہے آئے“ مذکورہ بالا قول ربیع رحمۃ اللہ سے بھی نقل۔

لیکن ایک دوسری قراءت میں ”الْمَلَائِكَةُ“ پر رفع کے بجائے جر ہے، اور اس کا عطف ”ظلل“ پر۔

یعنی کیا وہ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ بادل کے سائبانوں اور فرشتوں کے جھرمٹ میں آجائے۔ بعض قراءت

میں ”ظلل“ کے بجائے ”ظلال“ ہے، لیکن راجح پہلی ہی قراءت ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے

روایت اس کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، ارشاد ہے ”اھ

بنا کارب آئے گا، اور فرشتے قطار قطار“ دوسرے موقع پر ہے کہ ”یہ لوگ گویا صرف اس کے منتظر ہیں کہ ان

داخل ہو جائیں یا آپ کا پروردگار خود آئے یا ان کے پروردگار کی کوئی بڑی نشانی آجائے“

کچھ اضافہ کرنا ”فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ“ کا تعلق ”اللَّهُ“ سے ہے یا ”الْمَلَائِكَةُ

اس آخری شہرہ یعنی کون بادل کے سائبانوں میں آئے گا؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا تعلق ”اللَّهُ“ سے ہے، یعنی

جیسا کہ ہم سائبانوں میں فرشتے نہیں آئیں گے، مطلب یہ ہوگا کہ ”کیا وہ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ ان کے پاس

ان اہل کتاب کو سائبانوں میں آئے اور ان کے پاس فرشتے آئیں“ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ”بادل“ جس میں

کرتے تھے۔ ابن جریر نے اسے کا ذکر ہے، عام بادل نہیں ہے، بلکہ یہ وہ بادل ہے جس نے میدان تیبہ میں بنی اسرائیل پر سایہ کیا

میں صحیح تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آئے گا۔ قتادہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ ”اللہ ان کے پاس بادل کے

کتاب کو جو آپ پر آجائے، اور فرشتے ان کے پاس موت کے وقت آئیں“۔ عکرمہ نے فرمایا کہ ”اللہ بادل کے سائبانوں

فرشتے اس کے ارد گرد ہوں گے“ عکرمہ کے اس قول کی روایت ابن جریر نے کی ہے، اور کہا ہے

کہ دوسرے حضرات کا خیال یہ ہے کہ فرشتے موت کے وقت آئیں گے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "الملائکۃ" پر کسرہ ہے، اگرچہ ضمہ کے ساتھ بھی یہ مفہوم صحیح ہو سکتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ "بادل کے سائبانوں میں" کا تعلق صرف فرشتوں سے ہے، یعنی فرشتے بادل کے سائبانوں میں آئیں گے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے آنے کا تعلق ہے تو وہ اپنی شان کے مطابق جس طرح چاہے گا آئے گا چنانچہ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "یہ قیامت میں ہوگا، فرشتے بادل کے سائبانوں میں آئیں گے، اور اللہ رب العزت اپنی شان کے مطابق جس طرح چاہے گا آئے گا، میری رائے میں پہلا قول راجح ہے، یعنی "بادل کے سائبانوں میں" کا تعلق اللہ رب العزت سے ہے، اللہ تعالیٰ بادل کے سائبانوں میں آئے گا اور فرشتے بھی آئیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بعض بادل محراب والے ہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے حلقہ میں تشریف لائے گا۔ زیر تفسیر آیت میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے "بادل کے سائبانوں میں" آنے کی کوئی خاص صورت ہمیں معلوم نہیں، اس طرح کے امور میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں بس ان پر ایمان و اعتقاد کافی ہے، مثلاً اللہ کا آنا، اترنا وغیرہ۔ جب تک خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی وضاحت نہ ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تشریح نہ کر دی ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں ہمیں خود اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہنی چاہیے۔ بعض حضرات اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے آنے جانے، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر اللہ تعالیٰ کو بھی قیاس کرنا چاہیے، کہ وہ بھی اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ خود نہیں، بلکہ اس کا حکم ہے۔ اس سے قریب ایک قول یہ ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ کا حساب، اس کا ثواب و عذاب ہے، جیسے کہتے ہیں کہ "حاکم نے چور کو مارا،، حالانکہ مارنے والا بذات خود حاکم نہیں، بلکہ اس کام کے لیے اس کی طرف سے مقرر دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ "هَلْ يَنْظُرُونَ مَا يَنْظُرُونَ" کے معنی میں ہے، جیسا کہ اس سے پہلے ہم ایسی ترکیبوں کے متعلق بحث کر چکے ہیں۔ "الغمام" کا مفہوم بھی بیان کیا جا چکا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اسلام میں پوری طرح نہ داخل ہونے والے اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ بادل کے سائبانوں میں آجائے، اور فرشتے بھی، اور جو کچھ فیصلہ ہونا ہے وہ ہو جائے"۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن تم لوگ ستر سال تک ایک جگہ کھڑے رکھے جاؤ گے، تمہاری طرف نہ نظر کی جائے گی اور نہ تمہارا فیصلہ ہوگا، بلکہ تمہیں روکے رکھا جائے گا۔ تم اس صورت حال پر روؤ گے، اور اتنا روؤ گے کہ آنسو خشک ہو جائیں گے۔ پھر تمہیں آنسو دیا جائے گا، اور تم روؤ گے، اور آنسو ٹھوڑیوں، اور منہ تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت تم آہ دیکھا کرو گے اور فریاد کرو گے کہ ہمارے رب کے حضور میں ہماری کوئی شفاعت کر دے اور ہمارا فیصلہ ہو جائے۔ لوگ کہیں گے کہ ہمارے جد امجد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ موزوں اس کے لیے اور کون ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ نے ان کی مٹی بنائی، اپنے ہاتھ سے انہیں پیدا کیا، اپنی روح ان میں پھونکی اور ان سے گفتگو فرمائی!

چنانچہ لوگ آپ کے پاس آئیں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ان کے انکار پر لوگ دوسرے انبیاء کی خدمت میں باری باری حاضر ہو کر درخواست کریں گے، لیکن تمام انبیاء شفاعت سے انکار کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر سب لوگ میرے پاس آئیں گے۔ جب مجھ سے شفاعت کے لیے کہیں گے تو میں ”فحص“ کے پاس آؤں گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا، یا رسول اللہ! فحص کیا چیز ہے؟ حضور اکرم نے فرمایا کہ ”عرش کے آگے کا حصہ“۔ پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا، اور اس وقت تک سجدہ ریز رہوں گا جب اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو بھیجیں گے، وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھائے گا۔ پھر اللہ رب العزت مجھ سے ارشاد فرمائے گا، محمد! میں عرض کروں گا، میں حاضر ہوں۔ اور وہ تو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، کیا بات ہے؟ عرض کروں گا کہ لے میرے رب! آپ نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا، اس لیے اپنی مخلوق کے بارے میں میری شفاعت کو قبول فرمائیے اور لوگوں کا فیصلہ فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تمہاری شفاعت قبول کی، میں آتا ہوں اور تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔ حضور اکرم نے فرمایا کہ پھر میں وہاں واپس آ جاؤں گا اور لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ ابھی ہم کھڑے ہی ہوں گے کہ آسمان پر بڑی شدید قسم کی کھلبلی سنائی دے گی۔ ہم اس سے گھبرا جائیں گے۔ لیکن آسمان دنیا کے ساکنین، روئے زمین کے انسانوں اور جنوں سے دگنی تعداد میں زمین پر اتر رہے ہوں گے۔ جب یہ مخلوق زمین سے قریب ہوگی تو تمام روئے زمین انکے نور سے منور ہو جائے گی۔ وہ اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے، کیا ہمارے رب بھی تمہارے ساتھ تشریف لائے ہیں؟ وہ کہیں گے کہ نہیں، اللہ رب العزت کی آمد آمد ہے۔ اس کے بعد دوسرے آسمان کے ساکنین، پہلے آسمان والوں اور روئے زمین کے انسان و جنات سے دگنی تعداد میں اتریں گے۔ جب وہ زمین سے قریب ہوں گے تو روئے زمین ان کے نور سے منور ہو جائے گی۔ وہ اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے، کیا ہمارے رب بھی تمہارے ساتھ ہیں؟ وہ کہیں گے کہ نہیں، اللہ رب العزت کی آمد آمد ہے۔ اس کے بعد تیسرے آسمان کے ساکنین، اب تک اترنے والے تمام فرشتوں اور روئے زمین کے انس و جن سے دگنی تعداد میں اتریں گے۔ جب وہ زمین سے قریب ہوں گے تو روئے زمین ان کے نور سے منور ہو جائے گی۔ وہ بھی اپنی اپنی صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے، کیا ہمارے رب بھی تمہارے ساتھ ہیں؟ وہ کہیں گے کہ نہیں، آمد آمد ہے۔ اسی طرح دوسرے آسمانوں والے، اپنے سے پہلے آچکنے والوں سے دگنی تعداد میں آئیں گے۔ اس کے بعد رب السموات والارض بادل کے سائبانوں میں نزولِ اجلال فرمائے گا، اس کے ساتھ فرشتے ہونگے۔ فرشتے تسبیح گنگنا رہے ہوں گے، اور پڑھ رہے ہوں گے ”پاک ہے اس کی ذات جو مالک ہے عالم بالا کا، پاک ہے اس کی ذات جو رب ہے عرش کا، جبروت کا مالک، پاک ہے اس کی ذات جو زندہ ہے اور جس پر کبھی موت نہیں آئے گی، پاک ہے اس کی ذات جو تمام مخلوقات پر موت طاری کرتا ہے، لیکن خود اس پر موت طاری نہیں ہوگی، بہت زیادہ تسبیح کے قابل، سب سے بڑھ کر ذات پاک، فرشتوں اور روح الامین کا رب، وہ بہت زیادہ پاک ذات ہے، وہ بہت زیادہ پاک ذات ہے، پاک ہے اس کی ذات جو سب سے بلند و بالا ہے، پاک ہے ذات سلطنت والے، عظمت والے کی، پاک ہے اس کی ذات ہمیشہ ہمیشہ، اس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نزول

اجل فرمائیں گے، اس دن ان کے عرش کو اٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جہاں چاہیں گے اپنے عرش کو رکھنے کا حکم فرمائیں گے۔ پھر ایک پکارنے والا اتنی بلند آواز سے پکارے گا کہ تمام مخلوق سن لے گی۔ وہ اللہ کی طرف سے اعلان کرے گا کہ لے کر وہ جن وانس! جب سے میں نے تمہیں پیدا کیا اس وقت سے آج تک میں خاموش رہا، تمہاری باتیں سنتا رہا اور تمہارے اعمال دیکھتا رہا، اب تم خاموش ہو جاؤ، یہ تمہارے اعمال نامے ہیں، ان میں تمہارے سب اعمال لکھے ہوئے ہیں۔ پس جو شخص ان میں خیر پائے وہ اس پر اللہ کی حمد و شکر کرے، لیکن جسے اپنے اعمال نامہ میں اس کے سوا کوئی اور بات ملے اسے چاہیے کہ صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔ اس دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا فیصلہ کر دیں گے، جن وانس اور حیوانات سب کا!۔ یہ وہ دن ہو گا کہ جب بے سینگ والا جانور سینگ والے جانور سے راگرا اس نے کوئی تکلیف پہنچائی ہوگی، بدلہ لے لیگا اس حدیث سے قتادہ کی رائے غلط معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ فرشتے موت کے وقت آئیں گے، اور اسی کا ذکر آیت میں ”وَالْمَلَائِكَةُ“ میں ہے، لیکن اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے بھی قیامت کے دن حساب کے وقت آئیں گے صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کے اقوال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن ہم طوالت کے خوف سے ان کی تفصیلات چھوڑتے ہیں۔ حدیث اور اس کے موید صحابہ و تابعین کے اقوال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ”الْمَلَائِكَةُ“ پر رفع ہی صحیح ہے۔ اگرچہ جر کی قرابت میں بھی یہ معنی لیے جاسکتے ہیں، لیکن اس کے لیے دور از کار تاویلات کرنی پڑیں گی۔ ”وَقَضَى الْأَمْرَ وَاللَّهُ تَرْجِعُ الْأُمُورَ“ میں ”قَضَى الْأَمْرَ“ سے مراد مخلوق کا عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ ہے، جیسا کہ ابھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی گئی کہ قیامت کے دن ہر مظلوم ظالم سے اپنا حق وصول کر لے گا، بے سینگ کا جانور بھی سینگ والے جانور سے اپنا بدلہ لے لے گا۔ ”وَاللَّهُ تَرْجِعُ الْأُمُورَ“ یعنی قیامت کے دن مخلوق کے تمام فیصلے اور تمام معاملات جو دنیا میں ظلم و نا انصافی کے ہونے تھے سب اللہ کی طرف لوٹیں گے، اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرنے والا اپنا بدلہ پائے گا، اور طاعت و فرماں برداری کی زندگی گزارنے والے کو اس کے اعمال کے پھل ملیں گے۔ سب کو اپنا حق ملے گا، اور کافروں اور منکروں کے سوا... بہتوں پر اللہ کے افضال و انعامات ہوں گے اور... بہتوں کو اللہ معاف فرمائے گا، اسی لیے خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ ”اللہ کی طرف تمام معاملات رجوع کیے جائیں گے“۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کوئی معاملہ ایسا نہیں جس کا رجوع اللہ کی طرف نہ ہو، سب کی ابتداء بھی اسی کے امر سے ہے، اور بالآخر سب کا رجوع بھی اسی کی طرف ہوگا، اس کے دربار میں ظالم اور مظلوم، کمزور اور قوی، غریب اور مالدار سب برابر ہوں گے اور سب کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ قیامت کے دن مل جائیں گے، کسی پر ظلم نہیں ہوگا، بلکہ بہتوں پر فضل و انعام ہوگا۔ ”الْأُمُورَ“ پر الف لام بھی اسی لیے آیا ہے کہ مراد تمام امور و معاملات ہیں۔

”سَدَلُ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا أَتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةِ بَيْنَتِهِ“

یعنی اے محمد آپ بنی اسرائیل سے پوچھیے، جو آپ

الانعامات الہی کی بے قدری کرنے والوں کی سزا

کی نبوت اور آپ کی شریعت کی تصدیق کے ذریعہ توبہ کرنے اور میری طاعت اختیار کرنے کے لیے بس اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ میں ان کے پاس بادل کے سات بانوں میں آجاؤں اور میرے فرشتے بھی، اور پھر میں ان کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ کر دوں اور آپ پر ایمان لانے والوں اور آپ کے ذریعہ بھی ہوئی میری شریعت پر عمل کرنے والوں اور منکروں

کے درمیان آخری لکیر کھینچ دوں، ان سے پوچھیے کہ ”ہم نے انھیں کتنی ہی کھلی ہوئی نشانیاں دے رکھی تھیں، یعنی اپنے انبیاء کی تصدیق اور ان کی اتباع کے لیے، لیکن انھوں نے میری تمام نشانوں کو نظر انداز کیا، میرے تمام انعامات کی ناشکری کی، جو عہد و وصیت میں نے انھیں کی تھی اسے پس پشت ڈال دیا اور میرے انبیاء کو جھٹلایا۔“ وہ ایک ”کامفہوم“ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ زیر تفسیر آیت میں اس سے مراد، جیسا کہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، وہ تمام نشانیاں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور جن کا ذکر نہیں ہے، آیت کے مخاطب یہود ہیں۔ ربیع نے فرمایا کہ ان کھلی ہوئی نشانوں میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ”عصا“، آپ کا ”ید بیضار“، بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں راستہ بن جانا، اودھ اسی راستے میں ان کے دشمنوں کا ڈوب جانا، ان پر بادل کا سایہ کرنا، من و سلویٰ کا نزول، اور اس کے علاوہ بہت سی دوسری نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر نازل کی تھیں، لیکن تمام انعامات کے باوجود انھوں نے اللہ کے حکم کی مخالفت کی، اللہ کے انبیاء اور رسولوں کو قتل کیا اور اللہ نے جو عہد ان سے لیا تھا اسے تبدیل کر ڈالا۔ آگے آیت میں اسی کے متعلق ارشاد ہے کہ ”اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے، بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی ہے تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت ہے۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے حالات کی اطلاع دے کر اس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے جھٹلانے اور نافرمانی کرنے پر صبر کی تلقین کی ہے، کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں ان کی قومی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے، ان کے اسلاف نے ہمیشہ اپنے انبیاء کے ساتھ یہی کیا ہے۔ اس زمانہ کے یہودی بھی آخر میں تو انھیں کی نسل سے! بھلا اپنی واپا سے کیسے دستبردار ہو جائیں!۔

”وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ“ (اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے، بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی ہے، تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت ہے) میں ”اللہ کی نعمت“ سے مراد اسلام اور پوری شریعت اسلامی ہے۔ ”وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ“ یعنی جو کوئی اللہ کی نعمت، اسلام کو بدل ڈالے اور اس میں داخل ہونے اور اس پر عمل کرنے کے بجائے اس کا کفر کرنے لگے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے وہ سزا دے گا جس کا اس نے منکروں سے وعدہ کر رکھا ہے، اور اللہ کا عذاب بڑا سخت، بڑا دردناک ہوتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ لے تورات پر ایمان لانے والوں، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، کفر کو یک لخت چھوڑ دو، شیطان تمھیں جس گمراہی کی طرف بلاتا ہے اس کی طرف رخ بھی نہ کرو، تمہارے پاس میری طرف سے کھلی ہوئی نشانیاں آچکی ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک کھلی ہوئی نشانی ہیں، اور وہ تمام نشانیاں، دلائل و عبرتوں میں نے ان کے ذریعہ ظاہر کئے، پس میرے حکم کو، میرے عہد کو جو میں نے تم سے اپنی کتاب میں لیا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، تبدیل نہ کرو، کیونکہ جو کوئی بھی میرے حکم کو، اپنے پاس پہنچنے کے بعد بدلتا ہے اسے میں سخت اور دردناک سزا دیتا ہوں۔“ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ”وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ“ کی تفسیر میں نقل ہے کہ ”جو کوئی اللہ کی نعمت کا کفر کرتا ہے“ سدی اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی یہی مفہوم نقل ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ

دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے

أَمْوَالَهُمْ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ يَرْزُقُ

کرتے ہیں حالانکہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ میں ہوں گے قیامت کے روز اور روزی تو اللہ تعالیٰ

مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً

جس کو چاہتے ہیں بے اندازہ دے دیتے ہیں (ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے

فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ

پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی (کے وعدے) سنا دیتے تھے اور ڈر لسنے تھے اور ان کے ساتھ (آسمانی)

الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ

کتاب میں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرماویں

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ

اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولاً) وہ کتاب ملی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس

الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا

دلائل واضح پہنچ چکے تھے باہمی ضد ضدی کی وجہ سے پھر اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (مختلفین)

اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ بتلا دیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں

إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

اس کو راہ راست بتلا دیتے ہیں

”زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ خوش نما بنادی گئی ہے دنیوی زندگی ان لوگوں کی

دنیا کے دھوکے

نظر میں جو کافر ہیں، یعنی دنیوی زندگی میں گناہ ان کے لیے خوش نما کر دیئے گئے ہیں، اس لیے وہ کثرت مال کی طلب اور اس پر فخر و غرور کرتے ہیں، اور پھر اے محمد آپ پر ایمان اور آپ کی شریعت کی اتباع سے ان کا یہ غرور و کھنڈ مانع بنتا ہے، کیونکہ جن لوگوں نے آپ کی اتباع و تصدیق کی ان سے یہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، اور اس لیے بجائے آپ کی اتباع کے

”ان اہل ایمان سے جنہوں نے آپ کی اتباع کی، تسخیر کرتے ہیں، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی اتباع میں دنیا سے جائز و ناجائز ہر طرح کی لطف اندوزی اور اس کی یہ زینت باقی نہیں رہے گی اور جو لوگ ڈرتے رہتے ہیں، میرے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں، میری طاعت کرتے ہیں، دنیا کی لذات و شہوات سے اجتناب کرتے ہیں، تاکہ آپ کی اتباع پوری طرح کریں، اور میرے فرائض کی انجام دہی اور طاعت و عبادت کا جو بدلہ میرے یہاں سے انھیں ملنے والا ہے اسے وہ پالیں، یہ لوگ قیامت کے دن کفر کرنے والوں سے کہیں اوپر ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مومنین کو جنت میں داخل کرے گا، اور کافروں کو جہنم میں۔ حکمہ اور قتادہ رحمہما اللہ کی روایتیں اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ حکمہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ”کفار کہتے ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ہمارے نبی ہوتے تو آپ کی اتباع شرفار اور سردار کرتے، بخدا، ان کی اتباع کرنے والے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے محتاج اور غریب لوگ ہیں“ قتادہ نے ”فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ ”جنت میں ان سے (کفار سے) اوپر ہوں گے“

”وَاللَّهُ يَذُرُّهُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں، تقویٰ کی زندگی گزارنے والوں کو اپنی نعمتیں اور اپنے عظیم افضال بے شمار و بے حساب عنایت فرمائے گا۔ ”بِغَيْرِ حِسَابٍ“ کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں ان نعمتوں کے ختم ہونے کا خوف نہیں ہوگا کہ حساب و شمار کی ضرورت پڑے، کیونکہ دینے والا احسان اس لیے دیتا ہے تاکہ اسے معلوم رہے کہ کتنا اس نے دیا ہے، اور اس کی ملکیت میں کتنی کمی ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کسی طرح کی کمی کا کبھی کوئی خطرہ نہیں، اس لیے وہ بے شمار نعمتیں عطا فرمائے گا، اسے حساب و شمار کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

اختلاف کی بنیاد اور اس کا حل | ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ“

لوگوں ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے انبیاء بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ حق کیساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔ آیت میں ”امت“ کے معنی کے سلسلے میں مفسرین سے متعدد اقوال نقل ہیں، یعنی آیت میں جن لوگوں کے متعلق ارشاد ہے کہ ”لوگ ایک امت تھے“ ان سے کون لوگ مراد ہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام کے زمانہ تک کی تمام امتیں مراد ہیں، اس مدت میں دس قرین ہوئیں اور سب حق پر قائم تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر نقل ہے آپ نے فرمایا کہ آدم اور نوح علیہما الصلوٰۃ والسلام کے درمیان دس قرین آئیں، ان قرون میں تمام لوگ شریعت حق پر قائم تھے اس کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، بیان کیا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت ”كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا“ (لوگ ایک ہی امت تھے، پھر اختلاف کیا، اسے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، آپ کی روایت میں یہ بھی ہے

کہ اختلاف کے بعد سب سے پہلے نبی نوح علیہ السلام تھے۔ اسی کے ساتھ نابغہ ذبیانی کا یہ شعر بھی پیش نظر رکھیے

حَلَقْتُ فَلَمَّا تَرَكْتُ لِنَفْسِكَ رَيْبَةً
وَهَلْ يَأْتِيَنَّ ذُو أُمَّةٍ وَهُوَ كَلَامٌ
میں نے قسم کھالی اور تمہارے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوٹی، اور کیا اطاعت کی زندگی گزارنے والا کوئی دیندار بھی گنہگار ہو سکتا،

شعر میں ”امت“ یعنی دین استعمال کیا گیا ہے۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ لوگ ایک ملت اور ایک دین پر متفق تھے، پھر اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں انبیاء بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرلنے والے۔ اصلاً ”امت“ جماعت کے معنی میں ہے جو ایک دین و مسلک پر مجتمع ہو، پھر امت یعنی دین بھی استعمال ہونے لگا، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً“ اگر اللہ چاہے تو تمہیں ایک امت بنا دے، یعنی ایک دین اور ایک ملت رکھے والا۔ اسی لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ معنی بیان کیے ”وَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً“ یعنی سب لوگ ایک دین پر قائم تھے، پھر اختلاف کیا۔

دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام حق پر تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ذریت کے لیے انبیاء بھیجے۔ اس تفسیر میں ”امت“ کے معنی ”اللہ کی طاعت، اس کی وحدانیت کی دعوت اور اس کے احکام کی اتباع“ ہیں۔ یہ معنی ایک دوسرے موقع پر بھی مراد لیے گئے ہیں، ارشاد ہے ”رَأَتْ رَبًّا رَاهِمًا كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا“ (بلاشبہ ابراہیم اللہ کے اطاعت گزار ”امت“ اور بڑے ہی خدا پرست تھے) یہاں ”امت“ سے مراد ”امام“ ہے جس کی معاملات خیر میں اقتدار و اتباع کی جاتی ہے۔ مجاہد سے یہی قول منقول ہے کہ ”امت“ سے مراد آیت میں آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان دس انبیاء مبعوث ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرلنے والے جن حضرات کی یہ رائے ہے، غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ فرد واحد کو جو اپنے اوصاف و خصوصیات کی وجہ سے پوری جماعت پر بھاری ہو، ”امت“ (یعنی جماعت) کہا جاسکتا ہے، گویا جو خصوصیات اور عمدہ اوصاف پوری ایک جماعت میں ہوسکتے ہیں وہ تنہا ایک شخص رکھتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فرد واحد کو ”امت“ کہنے کی وجہ ان حضرات کے نزدیک یہ ہو کہ اخلاق خیر کی دعوت کی بنا پر وہ لوگوں کے اجتماع کا، اور انہیں ایک امت و جماعت کی شکل دینے کا سبب ہے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد بھی، اپنے اختلافات کے باوجود چونکہ آپ کے دین پر متفق تھے، اور اس اتفاق و اتحاد کا سبب آپ ہی تھے، اس لیے آپ کو ”امت“ کہا گیا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ”امت واحده“ سے مراد ”دین واحد“ ہے، یعنی جس دن تمام ذریت آدم کو آپ کی پشت سے نکال کر ”عہد الست“ لیا گیا تھا تو سب ایک دین پر قائم تھے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یوم الست میں اللہ تعالیٰ نے سب کو اسلام پر پیدا کیا تھا اور اس دن سب نے اللہ کے لیے اپنی عبودیت و بندگی کا اقرار کیا تھا، سب ایک امت تھے اور مسلم و مومن تھے۔ پھر آدم علیہ السلام کے بعد انہوں نے اختلافات کیے، ابی رضی اللہ عنہ آیت کی قرأت اس طرح کرتے تھے ”وَكَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَدَفُوا“، آخر تک۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اختلاف کے بعد انبیاء اور کتاب نازل کرتا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی قول نقل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آیت میں اس حالت کا ذکر ہے جب ذریت آدم کو آدم علیہ السلام کی پشت سے پیدا کیا گیا تھا، اس دن کے سوا بھی انسان امت واحدہ نہیں بنے۔ پھر جب دنیا میں اختلافات شروع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے۔ اس تفسیر اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں صرف اتنا فرق ہے ”امت واحدہ“ کا وقت اس تفسیر کی بنیاد پر یوم الست ہے، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ ہے۔ ایک اور قول بھی مروی ہے، جو تمام دوسرے اقوال سے مختلف ہے، یعنی لوگ ایک دین پر تھے، اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے

انبیاء بھیجے۔ اس قول کی نسبت بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے۔
 لیکن اس آیت کی مناسب اور راجح تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بندوں کو خبر دی ہے کہ لوگ ایک
 جماعت تھے اور ایک دین پر قائم تھے۔ چنانچہ سہمی سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ ”لوگ ایک دین، یعنی
 آدم علیہ السلام کے دین پر قائم تھے، پھر لوگوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، خوش خبری دینے والے
 اور ڈرنے والے، اور جیسا کہ ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جس دین پر لوگ اس وقت قائم تھے وہ دین حق تھا۔ آپ سے
 ایک دوسری روایت میں ہے کہ پھر جب لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے دین میں ان کے
 اختلاف پیدا کرنے کے بعد انبیاء بھیجے، جو ڈرانے والے اور خوش خبری دینے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب
 بھی نازل کی، تاکہ جس میں وہ اختلاف رکھتے ہیں انبیاء اس میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں، یہ اللہ کی طرف سے بندوں
 پر رحمت تھی، اور تاکہ لوگوں کے لیے عذر و معذرت کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ ممکن ہے، وہ وقت جب لوگ ”امت
 واحدہ“ تھے آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک کا زمانہ ہو یا یوم السبت ہو، جب آدم علیہ السلام کی تمام اولاد ان
 کے سامنے پیش کی گئی تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ جب سب لوگ ”امت واحدہ“ تھے ان دنوں کے سوا
 کوئی اور زمانہ ہو، بہر حال اللہ کی کتاب میں اس زمانہ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے اور نہ کسی صحیح حدیث سے اس کا ثبوت
 ملتا ہے، اس لیے ہمیں بھی وہی بات کہنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی، یعنی لوگ ایک جماعت تھے، پھر جب
 اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں انبیاء اور رسول بھیجے۔ کس وقت لوگ ایک جماعت تھے؟ اگر ہمیں اس وقت کا علم
 ہو جائے تو کوئی نفع نہیں ہوگا اور نہ اس سے عدم واقفیت کسی نقصان کا باعث ہے، کہ اس سے ہماری واقفیت
 اللہ تعالیٰ کی کسی طاعت کے لیے ضروری نہیں۔ البتہ اس حد تک یقین کے ساتھ کہا جاسکتا اور آیت میں اس کے لیے
 واضح دلیل موجود ہے کہ ”امت واحدہ“ سے مراد یہ ہے کہ لوگ ایمان اور دین حق پر ایک جماعت کی صورت میں
 متحد و متفق تھے، یہ اتفاق و اجتماع، جس کا ذکر آیت زیر تفسیر میں ہے، کفر و شرک پر نہیں تھا۔ اس کا ثبوت اس آیت
 سے بھی ملتا ہے جس میں یونس علیہ السلام کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ ”وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا
 وَكَلِمَاتُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لِقَضَىٰ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِئْتِهِ يَخْتَلِفُونَ“، اور انسان تو ایک ہی طریقہ پر تھے، پھر انہوں نے
 اختلاف کیا، اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے سے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس باب میں جس میں
 یہ اختلاف کر رہے تھے فیصلہ کر دیا گیا ہوتا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وعید اختلاف پر کی ہے، اتفاق اور امت واحدہ
 ہونے پر نہیں کی ہے۔ اگر اتفاق و اجتماع اختلاف سے پہلے ہوتا اور کفر پر ہوتا، تو اختلاف کی صورت یہ ہوتی کہ کچھ لوگ کفر سے
 الگ ہو کر ایمان اختیار کر لیتے، اور اس طرح اختلاف کی بنیاد پڑ جاتی۔ اگر یہ صورت ہوتی تو ایسے اختلاف پر وعید کی کوئی وجہ نہیں
 تھی، بلکہ ایسی صورت میں تو اختلاف پر اللہ کی طرف سے وعدہ اور اختلاف کرنے والوں کی تعریف ہونی چاہیے تھی کہ انہوں
 نے کفر سے علیحدگی اختیار کی اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ توبہ و انابت کی حالت میں بھی بندے پر اللہ کی وعید
 نازل ہو!۔ ”فَبَعَثَ اللَّهُ الْمَلَائِكَةَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ“ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے جنہوں نے
 اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو اللہ کے عظیم انعامات اور اس کی طرف سے ثواب کی خوشخبری دی۔ ”وَمُنذِرِينَ“ یعنی
 جنہوں نے کفر اور اللہ کی نافرمانی کی تھی انہیں اللہ کے دردناک عذاب سے ڈرایا۔ ”وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ“

لِيُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ“ اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے) میں ”کتاب“ سے مراد تورات ہے، یعنی تورات کے ذریعہ ان امور میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔ فیصلہ کی نسبت آیت میں ”کتاب“ کی طرف کی گئی، کیونکہ انبیاء اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، گویا اللہ کی کتاب ہی لوگوں کے درمیان حاکم و فیصل تھی۔

”وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تِلْكَ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ“، اس سے مراد یہودی اسرائیل ہیں، انھیں کو تورات اور اس کا علم دیا گیا تھا۔ ”أُوتُوهُ“ کی ضمیر ”وہ“ کتاب کی طرف لوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا ”مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تِلْكَ الْبَيِّنَاتُ“، یعنی اس کے بعد کہ اللہ کی نشانیاں اور اس کے دلائل ان کے پاس پہنچ چکے، اور ان پر یہ بات کھل گئی کہ جس کتاب اور اس کے احکام کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں وہ اللہ کے پاس سے بھیجی گئی ہے، وہی حق ہے اور اس میں ان کے لیے کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں، اور نہ اس کے خلاف عمل کی۔ انھیں یہودی اسرائیل کے متعلق اس آیت میں اللہ تعالیٰ اطلاع دے رہا ہے کہ ”انھوں نے اللہ کی کتاب تورات اور اس کے حکم کی مخالفت کی، اور یہ جانتے ہوئے اس میں اختلاف کیا کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اس میں اختلاف و نزاع اللہ تعالیٰ کے حکم میں اختلاف کے مراد ہے، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کے حکم میں ان کا یہ اختلاف اور اتنا عظیم گناہ ”اپس کی ضد کی وجہ سے“ تھا ”بَغْيًا“ مصدر ہے، بَغْيٌ فَلَانٌ عَلَىٰ فُلَانٍ، یعنی سرکشی کی اور حد سے تجاوز کیا۔ اسی لیے جو زخم بہت گہرا ہو، سمندر میں جب طغیانی آجائے۔ گھٹا جس سے موسلا دھار بارش ہو، ان سب کے لیے ”بغی“ کا استعمال ہوتا ہے، اور سب میں زیادتی اور حد سے متجاوز ہوجانے کا مفہوم مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی یہودی اسرائیل کا میری اس کتاب میں اختلاف جسے میں نے اپنے نبی کے ذریعہ ان پر نازل کیا تھا، کسی ناواقفیت کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ اس کے بعد تھا کہ کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ حق ان پر واضح تھا، اور اختلاف و نزاع کی وجہ صرف ”اپس کی ضد“ تھی، یہ اقتدار و ریاست کی لڑائی تھی، اپنے حریف کو نچا دکھانے کے لیے اللہ کی کتاب کو استعمال کیا جا رہا تھا، آیت کی تفسیر میں ربیع سے روایت ہے کہ اس آیت میں پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے، اور ارشاد ہوا کہ ”اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی نے جنھیں وہ کتاب ملی تھی، بعد اس کے کہ انھیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں“، اور انھوں نے یہ اختلاف دنیا کی حرص اور اس کی زینت حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، صرف ریاست و امارت اور لوگوں پر اقتدار حاصل کرنا مقصد تھا، اور اسی کا مقابلہ ہو رہا تھا، چنانچہ اس کے لیے ایک نے دوسرے پر حد سے تجاوز کیا اور قتل میں بھی مل نہیں کیا۔ ”فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ“، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں جو ایمان والے تھے وہ امر حق بتا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست بتا دیتا ہے ”فَهَدَى اللَّهُ“، یعنی پھر اللہ نے توفیق دی ”الَّذِينَ آمَنُوا“ سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنین کو توفیق دی، اور اپنے فضل سے انھیں وہ بتا دیا جس میں اہل کتاب اختلاف کرتے چلے آ رہے تھے۔ اگرچہ اہل کتاب اس میں اختلاف کی وجہ سے حقیقت سے دور ہوتے رہے، لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ

نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مومنین کے لیے اس کی نشاندہی کر دی، وہ ”جمعہ“ کا دن ہے، اہل کتاب اسکے پانے کے بجائے گمراہی کے راستے پر پڑ گئے، حالانکہ جمعہ ان پر بھی اسی طرح فرض تھا، جس طرح اس امت مسلمہ پر فرض ہے، لیکن یہود نے جمعہ کے بجائے سنچیر کے دن کی تعظیم کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہم آخری امت ہیں، اسکے باوجود اول ہیں،..... یعنی اہل کتاب کو کتاب اور شریعت ہم سے پہلے دی گئی تھی، اور ہمیں ان کے بعد عطا ہوئی۔ اور وہ جمعہ ہی کا دن تھا جس میں اہل کتاب نے اختلاف کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت کی، اور یہود نے اسے ایک دن بعد سنچیر کو سمجھا، اور نصاریٰ نے دو دن بعد اتوار کو سمجھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ بالا حدیث کی روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ امر حق بتا دیا جس میں کچھلی امتوں نے اختلاف کیا تھا۔“ آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہم آخری امت ہیں، اور قیامت کے دن سب سے پہلے رہیں گے، ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے، صرف فرق اتنا ہے کہ کچھلی امتوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ہمیں ان کے بعد دی گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ امر حق بتا دیا جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور یہی وہ دن (جمعہ کا) ہے جو اللہ نے ہمیں بتا دیا ہے، دوسری امتیں ہم سے پیچھے رہ گئیں، یہود نے دوسرے دن سنچیر کی تعظیم شروع کر دی، اور نصاریٰ نے تیسرے دن اتوار کی۔

وہ امر حق جس میں کچھلی امتوں نے اختلاف کیا تھا، اور امت مسلمہ کو بتایا گیا، اس کے متعلق دوسری رائے ابن زید رحمۃ اللہ کی یہ ہے کہ کچھلی امتوں نے نماز میں اختلاف کیا تھا، بعض مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بعض بیت المقدس کی طرف، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں صحیح قبلہ بتایا۔ اسی طرح کچھلی امتوں نے روزے میں اختلاف کیا، بعض فرقے آدھے دن کا روزہ رکھتے تھے، اور بعض رات رات کے کچھ حصے کا، پھر اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو روزے کا صحیح طریقہ اور وقت بتایا۔ اسی طرح کچھلی امتوں نے جمعہ کے دن کے بارے میں اختلاف کیا، یہود نے سنچیر کا دن اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں جمعہ کا صحیح دن بتایا۔ کچھلی امتیں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اختلاف رائے کرتی رہیں، یہودیوں نے کہا کہ وہ تو یہودی تھے، نصاریوں نے کہا کہ وہ نصرانی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے آپ کی برابرت کی، اور فرمایا کہ ”وہ بڑے ہی خدا پرست، اللہ کے فرمانبردار بندے تھے، اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے“ کچھلی امتوں نے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا تھا، یہود نے آپ پر تہمت لگائی اور نصاریٰ نے آپ کو خدا بنا لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ کے بارے میں امر حق کی ہدایت کی۔ زیر تفسیر آیت میں انہیں ہدایتوں کا ذکر ہے، یعنی بنی اسرائیل اور دوسرے اہل کتاب جن امور حق میں اختلاف و نزاع کر کے حق سے دور ہو گئے ان کی صحیح حقیقت اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو بتا دی۔ ربیع سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے کچھلی امتوں کے اختلاف و نزاع سے نکال کر امر حق کی ہدایت کی اور انہیں اس دین حق پر قائم کیا جس کے ساتھ اختلاف سے پہلے تمام انبیاء مبعوث ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے اجلاس کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا، اس کی بنیاد میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، نماز قائم کی، زکات دینے لگے، اور بعد کے اختلاف و نزاع سے پہلے اللہ کے تمام بندے جس واحد دین پر قائم تھے انہوں نے بھی اسی کو اختیار کیا، اسی لیے یہ امت تمام دوسری امتوں پر قیامت

کے دن گواہ ہوگی، قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم شعیب اور آل فرعون سب کے متعلق یہ گواہی دے گی کہ ان کے انبیاء نے حق ان تک پہنچا دیا تھا، لیکن ان قوموں نے اپنے نبی کی نافرمانی کی اور جھٹلایا۔ سدی سے روایت ہے کہ کفار نے اختلاف و نزاع کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو امر حق کی ہدایت کی "بِذِئْبِهِ" یعنی "اپنے علم سے"، اس امر حق کے متعلق جس کی طرف ان کی ہدایت کی تھی ہم بتا چکے ہیں کہ "بِذِئْبِهِ" بمعنی علم استعمال ہوتا ہے۔

"وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ" یعنی اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے، حق کا وہ راستہ جس میں کوئی گمراہی نہیں، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لائے۔ اس سے اہل حق کی اس رائے کی صحت کا ثبوت ملتا ہے کہ بندوں پر دینی یا دنیاوی جو نعمتیں بھی ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کھلی اہل کتاب امتوں نے امر حق میں اختلاف کیا، ہر اہل کتاب نے اپنے مخالف فرقہ کو جھٹلایا اور اس کی کتاب کا انکار کیا، حالانکہ تمام کتابیں اللہ کی طرف سے تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو صحیح راستہ بتایا کہ تمام کتابوں اور تمام انبیاء کی تصدیق ضروری ہے۔ لیکن پہلی تفسیر راجح ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واحد کے صیغہ کے ساتھ ایک کتاب میں اختلاف بتایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ

دوسری بات سنو) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں رہے مشقت، جاد داخل ہو گے حالانکہ تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش

خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزَلُوا

نہیں آیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ ان پر مخالفین کے سبب ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں

حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتٰى نَصُرَ اللّٰهُ

کہ (اُس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی۔

اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۴﴾

یا درکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک ہے۔

امتحان تمہارا بھی ہوگا

یعنی کیا اے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والو، تم یہ گمان رکھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، اور تمہیں ان مصائب و مشکلات سے گذرنا نہیں پڑے گا جن سے تم سے پہلے انبیاء اور رسولوں کی اتباع کرنے والے گذر چکے ہیں، اور جس طرح انھیں تنگی اور سختی سے آزمایا گیا تمہیں زیادہ نہیں جائے گا، اور کیا تمہیں اس طرح ہلا نہیں ڈالا جائے گا جس طرح انھیں دشمنوں کے خوف و رعب سے ہلا ڈالا گیا تھا یہاں تک کہ رسول اور مومنین خیال کرنے لگے کہ اللہ کی مدد پہنچنے میں دیر ہو رہی ہے، اور پکارا اٹھے کہ اللہ کی مدد آخر کب

آئے گی، اللہ آخر کب ہماری مدد کرے گا۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ "اللہ کی مدد ان سے قریب ہی ہے"؛ یقیناً اللہ تعالیٰ انھیں ان کے دشمنوں پر غلبہ دے گا اور ان سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کرے گا۔ جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں یہ آیت غزوہ خندق کے موقع پر نازل ہوئی۔ جب مؤمنین کو تمام قبائل عرب کی متحدہ طاقت، سخت سردی اور محاصرہ کی تلکیوں اور شدائد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی غزوہ کے شدائد و مشکلات کو ایک دوسرے موقع پر بیان فرمایا ہے "لے ایمان والو! اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو اور جب تم پر کئی کئی لشکر چڑھائے، پھر تم نے ان پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج جو تم کو کھانسی نہیں دیتی تھی، اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا تھا، جبکہ وہ لوگ تم پر آچڑھے تھے تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، اور جب کہ آنکھیں کھلی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے، اس موقع پر مسلمانوں کا پورا امتحان لیا گیا تھا اور وہ سخت زلزلے میں ڈلے گئے تھے"؛ "سُدی اور قتادہ رحمہما اللہ سے اس آیت کا یہی شان نزول نقل ہوا ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر نازل ہوئی تھی "لَمَّا يَا تَكْمُ" میں "لَمَّا" بمعنی "لَمَّا" ہے۔ اس سلسلے میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔

"مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ" یعنی "ان لوگوں جیسے حالات جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں" مثل بمعنی شذیہ ہے ربیع اور ابن جریر سے اسی طرح منقول ہے۔ "زُلْزَلُوا" میں زلزلہ سے مراد دشمن کا خوف ہے، زلزلہ کا معروف و مشہور مفہوم مراد نہیں ہے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدِينَ

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں آپ فرمادیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے

وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَى وَالسَّائِلِينَ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفَعَّلُوا

اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا اور مساکین کا اور مسافر کا اور جو نسا نیک

مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ⑤

کام کرو گے سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (اور وہ اس پر توابع ہیں گے)

صدقہ کہاں خرچ کیا جائے؟ یعنی لے محمد! آپ کے ساتھی آپ سے پوچھتے ہیں کہ اپنا کتنا مال صدقہ میں خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، کنھیں دیں، آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ مال تمھیں خرچ کرنا ہے اور صدقہ

دینا ہے اسے والدین کو دو، اپنے رشتہ داروں کو دو، تم میں جو یتیم ہیں، مسکین ہیں انھیں دو اور مسافروں کو دو، کیونکہ جو مال بھی تم انھیں دو گے، جو بھلائی بھی ان کے ساتھ کرو گے اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہے، تمام امور اس کے احاطہ علم میں ہیں اور وہ

تمھیں قیامت کے دن اس نیکی کا اور تمہاری فرمانبرداری کا بدلہ دے گا۔ "مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ" میں خیر سے مراد مال ہے جسے خرچ کرنے کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے سوال کیا تھا اور جس کا جواب اس آیت میں دیا گیا

ہے۔ "مَاذَا يُنْفِقُونَ" میں "مَاذَا" ائی شئی (کیا چیز) کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، یعنی وہ آپ سے سوال کرتے

ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اس صورت میں ”مَاذَا“ محل نصب میں ہوگا۔ دوسری صورت یہ کہ یہ محل رفع میں ہو، ”مَا الَّذِي“ یا ”أَيُّ شَيْءٍ“ کے معنی میں۔

یہ آیت زکات کے حکم کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ سدی سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو زکات فرض نہیں تھی، اس میں عزیز واقارب پر خرچ کرنے اور دوسرے صدقات کا حکم ہے۔ پھر آیت زکات نے اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ ابن جریج کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ اپنا مال کہاں خرچ کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آیت میں نفلی خرچ اور صدقہ کا بیان ہوا ہے، یہ زکات نہیں ہے، بلکہ زکات کا حکم اس کے علاوہ الگ سے ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ والدین، رشتہ داروں اور ان لوگوں پر خرچ کرو جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔ ابن ابی نجیح اور ابن زید سے بھی یہی قول نقل ہے۔ ابن زید کی روایت میں ہے کہ یہ صدقہ نفلی ہے اور جو مصارف بیان کیے گئے ہیں وہ ان لوگوں کے ہیں جو اس صدقہ کے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہیں۔ سدی سے جو یہ روایت منقول ہے کہ زیر تفسیر آیت زکات کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی اور زکات کے حکم نے اسے منسوخ کر دیا ہے، اس کی صحت کے لیے کوئی واضح ثبوت نہیں ہے، بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ آیت میں صرف انفاق کی ترغیب دی گئی ہے، اور خرچ کے جو مواقع بیان کیے گئے ہیں وہ اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ ان پر خرچ کرنا مزید فضیلت اور حصول ثواب کا باعث ہے۔ ترغیب کا یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی ہے ارشاد ہے کہ ”اور اس کی محبت میں مال صرف کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گروں اور سائلوں پر اور گروہوں کے آزاد کر دینے میں، اور نماز کی پابندی کرتے اور زکات ادا کرتے“۔ اس تفسیر کی تائید ابن جریج سے منقول قول سے بھی ہوتی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعاً) گراں (معلوم ہوتا) ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعتبار) خرابی ہو

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ

اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق

قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر قتال کرنا (یعنی عمدہ جرم عظیم سے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا)

وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ

کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے ان کو اس سے خارج کر دینا جرم عظیم

عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ

ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور فتنہ پر دازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے بدرجہا بڑھ کر ہے اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ رکھیں گے

حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمَّ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ

اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں اور جو شخص تم میں سے اپنے دین

مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فِيمَتٌ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ

سے پھر جاوے پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مر جاوے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

میں سب غارت ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ دوزخی ہوتے ہیں (اور) یہ لوگ

فِيهَا خَالِدُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا

دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترک وطن

وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ

کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں

وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

اور اللہ تعالیٰ اس غلطی کو معاف کرے گا اور رحمت کیلئے

جہاد کی فرضیت

”کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ“ کُتِبَ بِمَعْنَى فَرِضٌ ہے، یعنی تم پر قتال فرض کیا گیا ہے، یعنی مشرکین سے

قتال و جہاد۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ آیت سے مراد صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں

چنانچہ ابن جریر بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطاء سے اس آیت کے متعلق پوچھا کہ کیا اس آیت کی روشنی میں ہم سب پر قتال فرض

ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ صرف ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو نزول آیت کے زمانہ میں موجود تھے۔ ابو اسحق خزرجی سے

روایت ہے کہ میں نے اوزاعی سے اس آیت کا حکم پوچھا کہ کیا قتال تمام لوگوں پر فرض ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں

لیکن سربراہوں اور عوام کو قتال و جہاد چھوڑنا چاہیے، البتہ انفرادی طور پر ایک ایک فرد پر قتال و جہاد فرض نہیں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ قتال فرض کفایہ ہے، یعنی ابتداءً تو یہ سب پر ہی فرض ہے، لیکن اگر قوم کے لئے افراد اس کے

لیئے تیار ہو جائیں جن کی لڑائی میں ضرورت ہے تو تمام قوم سے فرض ساقط ہو جاتا ہے، جیسے نمازِ جنازہ، مردوں کو غسل

دینا، انھیں دفن کرنا، عمارت کی عام طور سے یہی رائے اور یہی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ولاتل اس

کے ثبوت میں متفق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”اور اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو پیٹھ رہنے والوں پر

درجہ میں فضیلت دی ہے، اور بھلائی کا وعدہ تو اللہ نے سب ہی سے کر رکھا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی فضیلت کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ مجاہدین کے ساتھ جہاد میں نہ شریک ہونے والوں کو بھی ”حسنی“ (بھلائی) سے نوازا جائیگا اگر جہاد میں عدم شرکت ہر حالت میں گناہ ہوتا تو ان کے لیے ”حسنی“ کا وعدہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتا۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قتال تمام مسلمانوں پر قیامت تک کے لیے فرض ہے۔ یہ قول سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے۔ ”کِتَاب“ کے مفہوم کے سلسلے میں ہم تفصیلی بحث پہلے کر چکے ہیں۔ ”وَهُوَ كُرَّةٌ لَكَ“۔ ”كُرَّةٌ“ بمعنی ذُو كُرَّةٍ ہے، یعنی ”درانخالے“ کہ وہ تم پر گراں اور باعث مشقت ہے، جیسا کہ ”وَأَسْأَلُ الْقَرْيَةَ“ میں مراد ”أَهْلُ الْقَرْيَةِ“ ہے۔ عطار رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے ہماری اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ ضمہ کے ساتھ ”كُرَّةٌ“ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی دوسرے کے جبر و اکراہ کے بغیر خود کسی نے کوئی کام اپنے اوپر مسلط کر لیا ہو، اور فتح کے ساتھ ”كُرَّةٌ“ کے مفہوم میں جبر و اکراہ پایا جاتا ہے، یعنی دوسرے کی طرف سے زبردستی اس پر مسلط کیا گیا ہو۔ چنانچہ معاذ بن اسلم سے روایت ہے کہ ”كُرَّةٌ“ بمعنی مشقت ہے، اور ”كُرَّةٌ“ بالفتح بمعنی اجار و اکراہ ہے۔ بعض اہل عربیت کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں، جیسے

”غُسْلٌ وَغُسْلٌ“ اور ”ضَعْفٌ وَضَعْفٌ“ وغیرہ

”وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ يُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ“ مطلب یہ ہے کہ جہاد کو گراں مت سمجھو، کیا عجب ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اسی طرح ترک جہاد کو پسند نہ کرو، وہ کیا عجب ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں باعث خرابی ہو، سدی سے روایت ہے کہ مسلمان جہاد کو مشقت کا کام سمجھتے تھے، اس لیے یہ آیت نازل ہوئی، ارشاد ہے کہ جہاد میں تمہارے لیے منافع ہیں، غنیمت حاصل ہو سکتی ہے، تم فتح مند ہو سکتے ہو، ورنہ شہادت پا سکتے ہو، جبکہ جہاد نہ کرنے میں یہ فوائد تمہیں حاصل نہیں ہوں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، حضور اکرم نے فرمایا، ابن عباس! اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہارے لیے لکھ دیا ہے، اگرچہ تمہاری خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اس پر خوش رہو، کیونکہ اللہ کی کتاب میں یہی کہا گیا ہے۔ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! کتاب اللہ میں یہ حکم کہاں ہے؟ اس پر اس حضور نے اسی آیت کی تلاوت کی۔ ”وَاللَّهُ يَتْلُمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“ یعنی اللہ جانتا ہے، کہ تمہارے لیے کیا چیز بہتر ہے اور کیا چیز بُری ہے، اس لیے اگر اس نے تم پر دشمنوں سے جہاد فرض کیا ہے تو تمہیں اس کے حکم کے مطابق جہاد کرنا چاہیے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاد تمہارے لیے ہی مفید اور بہتر ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، وہ اور تم نہیں جانتے، یعنی جو فوائد و مضرتیں اللہ کے علم میں ہیں ان تک تمہاری دسترس کہاں ہے! اس میں جہاد کے لیے مزید ترغیب ہے۔

”يَسْتَأْذِنُكَ عَنِ الشُّهُرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ“
 وَصَدُّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكَفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَلَا خُرَاجَ أَهْلِهِ

فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے

”مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ“ (اور آپ سے حرمت والے نہیں ہیں قتال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اس میں قتال کرنا بڑا جرم ہے، اور اس سے کہیں بڑے جرم) اللہ کے نزدیک اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روک دینا اور اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال

دینا ہے، اور فتنہ قتل سے کہیں بڑھ کر ہے، ”حرمت والے مہینے“ سے مراد رجب ہے، ”قِتَالِ فِيهِ“ کو جبراً سوچ سے ہے کہ ”عَنْ“ اس سے پہلے مقدر ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ تو ”عَنْ قِتَالِ فِيهِ“ قرار ت کرتے تھے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ لے محمد، آپ کہہ دیجئے کہ حرمت والے مہینے میں قتال کرنا بہت بڑا جرم ہے، یعنی اس کی حرمت کو توڑنا اور اس میں خون ریزی کرنا اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔ عرب جاہلیت میں بھی حرمت والے مہینوں کا احترام کیا جاتا تھا، چنانچہ ان مہینوں میں کوئی شخص اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کی بچو بھی نہیں کرتا تھا۔ قبیلہ مضر والے ان مہینوں کو ”أَصْفَر“ دگو نگا کہتے تھے، کہ ان میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی نہیں دیتی تھی۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرمت والے مہینوں میں غزوہ نہیں کیا کرتے تھے، البتہ اگر مسلمانوں پر ہی کسی طرف سے حملہ ہوتا تو مدافعت کرتے تھے۔ اگر کسی غزوہ میں حرمت والے مہینے شروع ہو جاتے تو لڑائی بند کر دیتے تھے، اور ان مہینوں کے نہم ہونے کے بعد لڑائی دوبارہ شروع کرتے تھے۔ ”صَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ“ یعنی اللہ کے راستے سے روکنا۔ بولتے ہیں ”صَدَّ فُلَانٌ بَوَّجْهًا عَنْ فُلَانٍ“ یعنی فلاں شخص فلاں کے سامنے آگیا اور دیکھنے بھی نہیں دیا۔ ”وَكَفَّرَ بِهِ“ میں یہ کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکنا، اللہ سے کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور ان لوگوں کو جو اس کے رہنے والے اور اس کے متولی ہیں وہاں سے نکال دینا، یہ سب حرمت والے مہینے میں قتل سے بھی بڑھ کر ہیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ ”اور فتنہ تو قتل سے بھی کہیں بڑھ کر ہے“۔ ”فتنہ سے مراد یہاں شرک مفسرین متفق ہیں کہ یہ آیت ابن الحضرمی کے قتل پر نازل ہوئی تھی۔ عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدرِ اولیٰ سے واپس ہوتے ہوئے رجب کے مہینے میں عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو آٹھ ماہجرین کیساتھ بھیجا۔ اس جماعت میں انصار کا کوئی فرد بھی نہیں تھا۔ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھ کر بھی دیا اور فرمایا کہ دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد اسے دیکھیں، اس سے پہلے نہ دیکھیں۔ اس کے بعد اس مکتوب میں جو حکم ہے اس پر عمل کریں، اور کوئی شخص بھی حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہ کرے۔ چنانچہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد مکتوب کو کھولا، اس میں لکھا ہوا تھا کہ ”میرا یہ مکتوب دیکھتے ہی آگے بڑھو اور مکہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ میں پڑاؤ کرو، اور وہاں سے قریش کے حالات کی نگرانی کرو اور ان کی تمام خبریں ہمارے پاس بھیجو“ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے مکتوب کو پڑھ لینے کے بعد کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے، پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مقام نخلہ پہنچ جاؤں اور وہاں سے قریش کے حالات کی نگرانی رکھوں، اور اس سے منع فرمایا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہ کرے، اس لیے جو کوئی شہادت چاہتا ہے وہ اس کی تمنا رکھتا ہے وہ چلے اور جسے یہ پسند نہ ہو وہ لوٹ جائے، میں تو بہر حال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ چنانچہ آپ روانہ ہو گئے اور آپ کے ساتھ آپ کے ساتھی بھی روانہ ہوئے، ان میں سے کوئی بھی

بلکہ ائمہ اربعہ اور جہور فقہاء اس کے قائل ہیں کہ قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے، اور اب جہاد ان مہینوں میں بھی دوسرے عام مہینوں کی طرح، کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی آچکا ہے، محرم الحرام، رجب المرجب، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ حرمت والے مہینے ہیں۔

واپس نہیں آیا جب یہ قافلہ مقام معدن پر پہنچا تو قافلہ کے دو افراد سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن نضوان رضی اللہ عنہما راستہ بھول کر پیچھے رہ گئے، لیکن عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ چلتے رہے اور مقام نخلہ میں پہنچ کر پڑاؤ کیا۔ پھر قریش کا اونٹوں کا ایک قافلہ جس پر کشمش، چمڑا اور دوسرے تجارتی سامان لادے ہوئے تھے، گزرا۔ اس قافلہ میں عمرو بن حضری، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل وغیرہ تھے۔ مسلمان اس قافلہ کو دیکھ کر گھبرائے، پڑاؤ بھی اس قافلہ کی گذرگاہ سے قریب ہی کیا تھا۔ عکاشہ بن محسن رضی اللہ عنہ نے (جو مسلمانوں کے قافلہ میں تھے) جھانک کر انھیں دیکھا، آپ سر منڈائے ہوئے تھے، مشرکین قریش نے بھی آپ کو دیکھ لیا اور چونکہ آپ سر منڈائے ہوئے تھے اس لیے انھوں نے کہا کہ یہ لوگ عمرہ کے لیے آئے ہوں گے، انھیں کیوں چھڑیں۔ پھر مسلمانوں نے اس تجارتی قافلہ کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس دن جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ تھی مسلمانوں نے کہا کہ اگر انھیں آج رات چھوڑ دیا جاتا ہے تو یہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور تمہارے لیے مشکلات پیدا کریں گے، اور اگر انھیں قتل کیا جائے تو یہ قتل حرمت والے مہینے (رجب) میں ہوگا، اس لیے کوئی اقدام کرنے میں پس و پیش تھا۔ آخر سب نے دل مضبوط کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو بھی قابو میں آجائے اسے قتل کر دینا چاہیے اور ان کا سامان تجارت لوٹ لینا چاہیے۔ چنانچہ واقعہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے عمرو بن الحضری کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا اور وہیں ڈھیر کر دیا، عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کيسان کو قید کر لیا۔ نوفل بن عبداللہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور مسلمان اسے پکڑ نہ سکے۔ پھر عبداللہ بن جحش اور آپ کے ساتھی رضی اللہ عنہم اونٹوں پر لدے ہوئے سامان اور قیدیوں کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ جب یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حرمت والے مہینے میں قتال کا حکم تو نہیں دیا تھا، چنانچہ آپ نے قیدی اور مال لینے سے انکار فرمایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انھیں ملامت کی اور کہا کہ جس کا تمہیں حکم نہیں تھا تم نے وہ بھی کر ڈالا، حرمت ہم تو برباد ہو گئے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی انھیں ملامت کی اور کہا کہ جس کا تمہیں حکم نہیں تھا تم نے وہ بھی کر ڈالا، حرمت والے مہینے میں قتال کی تو کسی کو بھی اجازت نہیں، پھر تم نے اس مہینے میں قتال کیوں کیا؟ قریش یہ طعنہ دینے لگے کہ اب محمد اور ان کے ساتھیوں نے حرمت والے مہینے کو حلال کر لیا اور اس میں خون بہانے، قیدی بنانے اور مال لوٹنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ یہودیوں نے اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بد فانی ڈھونڈھنی شروع کر دی اور کہا کہ ابن الحضری کو واقعہ عبداللہ بن جحش نے قتل کیا، حضری سے یہ نکلتا ہے کہ ”حضرت الحزب“، لڑائی آپہنچی ہے) واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”وقیات الحزب“ (جنگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں)۔ جب اس واقعہ پر ہر طرف سے زلے زنی ہونے لگی تو یہ آیت نازل ہوئی اور ارشاد ہوا کہ حرمت والے مہینے میں قتال یقیناً جرم ہے، لیکن فتنہ تو قتل سے کہیں بڑھ کر جرم ہے، اگر مسلمانوں نے انھیں حرمت والے مہینے میں قتل کیا ہے تو انھوں نے مسلمانوں پر اس سے بڑھ کر مظالم کیے ہیں، انھوں نے اللہ کے کفر ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو بھی اللہ کے راستے سے روکا، مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکا، اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالا، ان کے یہ اعمال اللہ کے نزدیک اس قتل سے کہیں بڑھ کر ہیں، اور اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے کہیں بڑھ کر جرم ہے، یعنی مسلمانوں کو تم اللہ کے دین کے بارے میں فتنہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے، اور ہمیشہ اس کی جدوجہد کرتے رہے کہ انھیں پھر کفر کی طرف لوٹائیں یہ عمل تو قتل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اس سے بھی زیادہ برے

ارادے رکھتے ہیں، وہ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں جب یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے کشادگی پیدا کر دی تو حضور اکرم ص نے بھی قیدی اور مال لے لیے۔ یہ قول روایتوں میں معمولی اختلاف و اختصار کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ، جذب بن عبد اللہ، سدی، مجاہد، ابومالک، عطار، ضحاک بن مزاحم اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابومالک کی روایتوں میں ہے کہ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ جمادی الاخریٰ کی آخری تاریخ ۳۰ رجب تا تاریخ ۳۱ ہے، لیکن (چاند ۲۹ کا ہوا تھا اور) تھی وہ یکم رجب۔ بعض روایتوں میں ہے کہ مسلمانوں کو شبہ تھا کہ ۳۰ جمادی الاخریٰ ہے، یا یکم رجب۔

اس آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ”حرمت والے مہینے میں قتال کرنا بڑا جرم ہے“ اس حکم کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سورہ برات کی آیت ”بے شک مہینوں کا شمار اللہ کے نزدیک بارہ ہی مہینے ہیں، کتاب الہی میں (اس روز سے) جس روز کہ اس نے آسمان اور زمین پیدا کیے، اور ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہی دین مستقیم ہے، سو تم ان کے بارے میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو، اور لڑو مشرکوں سے سب سے جیسا کہ وہ لڑتے ہیں“ اور بعض دوسری آیتوں سے منسوخ ہے۔ عطار بن میسرہ اور زہری کی یہی رائے ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم منسوخ نہیں ہوا، بلکہ اب بھی باقی ہے۔ عطار کی یہی رائے ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ عطار نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے، بلکہ اب بھی باقی ہے۔

میری رائے میں عطار بن میسرہ کا قول صحیح ہے کہ یہ آیت قرآن مجیدی کی دوسری آیتوں سے منسوخ ہو گئی ہے۔ اوپر مذکور سورہ توبہ کی آیت سے بھی واضح طور پر یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ متواتر روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین حرمت والے مہینے ہی میں کیا تھا، اور ابو عامر رضی اللہ عنہ کو جنگ کے لیے قبیلہ اوطاس کی طرف حرمت والے مہینے میں ہی بھیجا تھا۔ اگر حرمت والے مہینوں میں جنگ و قتال گناہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مہینوں میں کوئی غزوہ کرتے۔ اسی طرح قریش کے ساتھ جنگ کے لیے مقام حدیبیہ کی بیعت، بیعت رضوان، ذی قعدہ میں آئی تمام علماء سیرت اس پر متفق ہیں۔ ظاہر ہے کہ عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ سلمہ میں پیش آیا تھا اور غزوہ حنین و طائف سلمہ میں ہوا تھا۔

”وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا“ یعنی مشرکین قریش تم سے جنگ جاری رکھیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ عروہ بن زبیر اور مجاہد رحمہما اللہ سے یہی مفہوم نقل ہے۔ عروہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ”توبہ و رجوع تو کیا، وہ تمہارے بارے میں اس سے بھی زیادہ بڑے ارادے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے دین سے ہی پھیر دیں اور دوبارہ تمہیں کفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیں“

”وَمَنْ يَزِدْكُمْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فِيمَتَّ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“ یعنی ”اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے“

”يَزِيدُ“ بمعنی ”بڑھائے“ اور ”نار“ لٹائی ہے، ”فَارْتَدَّ عَلَيَّ آثَارُهَا“ قصصاً، (پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان پر اٹھے چلے) میں بھی یہی معنی ہیں۔ بولتے ہیں ”رَأْسُكَ فُلَانٌ حَقْلُهُ مِنْ فُلَانٍ“ یعنی فلاں نے فلاں سے اپنا حق واپس مانگا۔ ”اور مرجائے اس حال میں کہ وہ کافر ہے“ یعنی دین اسلام سے پھر کر کفر اختیار کرے، اور توبہ سے

پہلے کفر ہی کی حالت میں مر جائے، تو یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔ ”وَجِبَتْ
 اَعْمَالُهُمْ“ یعنی بطلت اعمالہم، ذہبت ان کے اعمال اکارت گئے، باطل ہوئے، یعنی دنیا و آخرت میں اس پر
 جو اجر و ثواب انہیں ملتا وہ نہیں ملے گا۔ اور یہ لوگ اہل دوزخ ہیں، اس میں ہمیشہ پڑے رہنے والے، یعنی جنہوں نے دین
 اسلام سے ارتداد اختیار کیا اور کفر کی طرف لوٹ گئے ہوں اور کفر ہی کی حالت میں ان کی موت واقع ہوئی ہو۔ ”وَأَهْلُ
 النَّارِ“ اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ اب جہنم کے باشندے ہو گئے، اس میں سے کبھی باہر نہیں آئیں گے جیسے ”اہل محلہ“
 ساکنین محلہ کو کہتے ہیں جو محلہ میں سکونت پذیر ہوں۔ ”هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“ یعنی وہ اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے، ان
 کے وہاں پڑے رہنے کی کوئی مدت متعین نہیں، اور نہ اس کی کوئی انتہا ہے۔

اللہ کی رحمت، اپنے پاک بندوں پر

”رَأَى الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاءُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ
 يُرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ یعنی جن لوگوں نے اللہ اس
 کے رسول اور اس نیک شریعت کی تصدیق کی جسے رسول لے کر مبعوث ہوئے، ”اور جنہوں نے ہجرت کی، یعنی جنہوں نے
 اپنے شہر سے، مشرکین کا پڑوس چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کر لی۔ ”مُهَاجِرَةٌ“ اصلاً کینہہ دشمنی کی وجہ سے ایک شخص
 کا دوسرے شخص سے قطع تعلق کر لینے کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال عام ہو گیا اور ہر اس شخص کے لیے اس کا استعمال کیا
 جانے لگا جو کسی چیز کو ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑ دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک جماعت کو بھی مہاجرین
 اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آپ حضرات نے اپنا گھر بار اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ مشرکین کے پڑوس میں ان کے غلبہ و تسلط کے
 تحت رہنا پسند نہیں تھا، کیونکہ ان کے ساتھ رہنے کی صورت میں دین کے بارے میں فتنہ میں پڑ جانے کا خوف تھا،
 اس لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ”وَجَاهِدُوا“ یعنی قتال کیا، جنگ
 کی، ”جُجَاهِدَةٌ“۔ ”جُهَادٌ فَلَانٌ فَلَانًا“ سے نکلا ہے، یعنی فلاں کو فلاں نے مشقت اور تکلیف میں ڈال دیا۔
 جب ہی عمل جانبدار سے ہو اور اس عمل کے کرنے والے دو فریق ہوں تو اس کے لیے ”جُجَاهِدَةٌ“ سے ”جُجَاهِدٌ
 فَلَانٌ فَلَانًا“ بولتے ہیں، یعنی دونوں فریق اپنے حریف و مقابل کو مشقت اور تکلیف میں ڈالنے کی کوشش کرتے
 ہیں، ”جہاد“ کا بھی یہی مفہوم ہے۔ ”سَبِيلِ اللَّهِ“ سے مراد اللہ کا راستہ اور اس کا دین ہے۔ آیت کا مفہوم یہ
 ہے کہ ”اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یعنی جن لوگوں نے مشرکوں کے غلبہ کے تحت اور ان
 کی حکمرانی میں رہنا پسند نہیں کیا، اور اپنے دین کے بارے میں فتنہ کے خوف سے وہاں سے دوسری جگہوں میں چلے
 گئے، اور اللہ کے دین کے لیے ان سے جنگ کی، ”یہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھیں گے،“ یعنی انہیں لوگوں کو اس کی
 امید ہوگی کہ اللہ ان پر رحم کرے گا اور اپنے فضل و کرم سے انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ اور اللہ اپنے بندوں کے
 گناہوں کو اپنے عفو کے ذریعہ چھپانے والا اور ان پر مزید رحمت و مہربانی کرنے والا ہے۔ یہ آیت بھی عبد اللہ بن جحش
 اور ان کے ساتھیوں (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں ہی تازل ہوئی تھی، جیسا کہ جناب بن عبد اللہ، عروہ بن زبیر،
 قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرمادیجئے کہ ان دونوں کے استعمال میں گناہ کی بڑی ہی باتیں بھی ہیں

لِلنَّاسِ وَإِثْمَهَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهَا ط وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ط

اور لوگوں کو (بعض) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ

قُلِ الْعَفْوَ ط كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٣﴾

کیا کریں۔ آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو اللہ تعالیٰ اسی طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت کے

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامِ ط قُلْ إِصْلَاحُ

معاملات میں سوچ لیا کرو اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت

لَهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَارْحَمُوا ط وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ

رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ تمہارے (دینی) بھائی ہیں اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی

مِنَ الْمُصْلِحِ ط وَكُوشَاءِ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ

رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتے کیونکہ اللہ تعالیٰ

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤﴾

زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

چند سوالات کے جوابات

”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ

إِثْمَهَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهَا“ یعنی اے محمد! آپ کے صحابہ شراب اور اس کے پینے

کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ”میسر“ ہر اس مشروب کو کہتے ہیں جو عقل کو مخمور کر دے اور اس پر پردہ ڈال دے،

”مخمرت الائناء“ (میں نے برتن ڈھک دیا) سے ماخوذ ہے، بولتے ہیں ”هُوَ فِي خَمَارِ النَّاسِ وَبِخَمَارِهِمْ“

یعنی لوگوں کے انہوہ میں گھس گیا اور نظروں سے چھپ گیا۔ خواہ دوا ہو یا کوئی اور نشہ آور چیز، اگر عقل کو مخمور کر دیتی ہے

اور عقل اس سے مغلوب ہو جاتی ہے تو وہ ”خمر“ شراب کہلانے کی عورت کے دوپٹے کو بھی ”خمار“ اسی

لینے کہتے ہیں کہ وہ سر کو چھپاتا ہے۔ ”هُوَ يَكْتُمُ لَكَ الْخَمْرَ“ یعنی تم سے چھپ کر چلتا ہے۔ عجاج کے اس شعر

میں بھی ”الخمر“ کا یہی مفہوم ہے۔

فِي لَامِجِ الْعُقَبَانِ لَا يَأْتِي الْخَمْرُ

يُوجِّهُ الْأَرْضَ وَيَسْتَأْتِي الشَّجَرُ

وہ چھپ کر نہیں چلتا، بلکہ اہلہاتے ہوئے علموں کے جلو میں زمین پر چلتا ہوا اور درختوں کو کاٹتا ہوا۔

”الْمَيْسِرُ“ مَفْعَل کے وزن پر ”يَسْرُكَ لِي هَذَا الْأَمْرُ“ سے ماخوذ ہے، یعنی مجھ پر یہ چیز واجب ہوگئی۔ ”الْيَاسِرُ“ جو تیسرے کے ذریعہ (جوئے سے) واجب ہو، جواری کو ”يَا سِرُّ“ اور ”مَيْسِرُ“، یعنی جوا۔ ابن عباس اور عبد اللہ رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابوالاحوص، ابن سیرین، عطار، طاؤس، سعید، حسن، قتادہ، سدّی، ضحاک اور کچول رحمہم اللہ سے ”مَيْسِرُ“ کے یہی معنی نقل ہیں۔ مجاہد، عطار اور طاؤس کی روایتوں میں ہے کہ بچوں کا اخروٹ وغیرہ سے ٹھیلنا بھی ”مَيْسِرُ“ ہے۔ عمر بن عبد اللہ نے قاسم بن محمد سے پوچھا، کیا جو سر اور شرطج بھی ”مَيْسِرُ“ (جوا) ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے ذکر اور نماز سے انسان کو غافل کر دے ”میسر“ ہے۔ ”قُلْ فِيهَا لَكُمْ كَيْبِرٌ“ یعنی اے محمد! آپ اپنے صحابہ سے کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں ”یعنی شراب اور جوئے میں“ بڑا گناہ ہے۔ ”سدی سے اس بڑے گناہ کے متعلق نقل ہے کہ ”شراب کا گناہ“ تو یہ ہے کہ انسان شراب کے نشہ میں لوگوں کے لیے باعثِ آزار بنتا ہے اور ”مَيْسِرُ“ کا گناہ“ یہ ہے کہ جو اکیل کر دوسرے کا حق مارتا ہے اور ظلم کرتا ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ قرآن مجید کی یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں شراب کے خلاف حکم نازل ہوا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ”ان میں بڑا گناہ ہے“ سے مراد یہ ہے کہ شراب پیتے وقت آدمی کا دین کمزور پڑ جاتا ہے۔ راجح تفسیر سدّی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، یعنی شرابی جب نشہ میں ہوتا ہے تو شراب کی وجہ سے اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے اور معرفت رب سے قاصر رہتا ہے، بھلا اس سے بڑھ کر گناہ اور کیا ہوگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کا یہی مفہوم ہے۔ اور تیسری بُرائی یہ ہے کہ یہ انسان کو اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کر دیتا ہے، اور اس کی وجہ سے جواریوں میں باہم دشمنی پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے ”وَدَشَيْطَانٌ تَوَلَّيْنَا يَأْتِيكَ بِهِ سُبُحَانَ اللَّهِ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ“ اور جوئے کے ذریعہ سے ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔“

”وَيَسْرِ الْفُرُجَ لِلنَّاسِ“ (اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں) شراب کے فائدوں میں، اس کی حرمت کے حکم سے پہلے، اس کی خرید و فروخت کے فائدے اور اس کے پینے کی لذت وغیرہ آجاتی ہے۔ عربی اشعار شراب کے کیف و سرور اور اس کے پینے کے بعد کی امنگوں کے لیے شاہد ہیں۔ جوئے کے فائدوں..... سے مراد جتنے والے کا فائدہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سدّی رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔ مدینہ کے اکثر اور کوفہ و بصرہ کے بعض علماء قرأت نے ”رَأْتُهُمْ كَبِيرٌ“ پڑھا ہے لیکن بصرہ اور کوفہ ہی کے بہت سے قاریوں نے ”رَأْتُهُمْ كَبِيرٌ“ پڑھا ہے۔ دراصل دونوں قاریوں کا ایک ہی ہے، لیکن راجح قرأت پہلی ہی ہے، کیونکہ علماء قرأت کا اس پر اجماع ہے، اس کے بعد ”أَكْبَرُ“ کے لفظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

”وَرَأَتْهُمَا الْأَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا“ یعنی شراب اور جوئے کا گناہ اور اس کی مضرت و نقصان ان کے فائدوں سے جنھیں تم حاصل کرتے ہو، کہیں بڑھا ہوا ہے۔ شراب پینے کے بعد گالم گھوج اور اس سے بڑھ کر قتل و قتال ایک عام بات تھی۔ جوئے کے سبب سے شر و فساد بھیلتا تھا اور اکثر باہم دشمنی و عداوت پیدا ہوتی تھی۔ یہ آیت شراب کی حرمت کے حکم سے

۱۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں جس میں ہر حیثیت سے صرف مضرت و نقصان ہی ہو، فائدہ و نفع کا کوئی پہلو سرے سے ہو ہی نہ سکتا ہے۔
 ۲۔ ہر چیز میں پہلو موجود ہے اور بُری سے بُری چیز میں نفع کے پہلو، یہ تو صرف آخرت کی خصوصیت ہے (باقی بر صوفہ آئندہ)

پہلے نازل ہوئی تھی، اس لیے اس کی طرف ”اشحہ“ (گناہ) کی نسبت کی کہ یہ گناہ کا سبب بنتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”حرمت کے حکم سے پہلے کے ان کے فائدوں کے مقابلہ میں حرمت کے حکم کے بعد ان کے گناہ کہیں بڑھ کر ہیں“ ابن عباس رضی اللہ عنہ، ربیع اور علی بن ابی طلحہ سے اس کی روایت ہے۔ لیکن ہم نے اس کے بجائے پہلی تفسیر اس لیے پسند کی کہ متواتر روایتوں سے ثابت ہے کہ یہ آیت شراب اور جوئے کی حرمت کے حکم سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ سعید بن جبیر کی روایت میں ہے کہ جب زیر تفسیر آیت نازل ہوئی تو بہت سے صحابہ شراب کو ناپسند کرنے لگے، لیکن اب بھی بعض صحابہ پیتے تھے۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ”لے ایمان والو، نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اسے سمجھنے لگو“ تو پینے والوں نے نماز کے اوقات میں پتیا چھوڑ دیا۔ لیکن جب نماز کا وقت قریب نہ ہوتا تو پیتے تھے۔ آخر آیت ”شراب اور جو اور بت اور پائے تو بس نری گندی باتیں ہیں، شیطان کے کام، سو اس سے بچے رہو تا کہ فلاح پاؤ“ نازل ہوئی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس آخری آیت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب شراب حرام کر دی گئی ہے۔ زید بن علی کی روایت میں تفصیل ہے، آپ نے بیان کیا کہ شراب کے بارے میں تین مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ سب سے پہلے زیر تفسیر آیت نازل ہوئی بعض صحابہ اس کے بعد بھی پیتے تھے۔ اتفاق سے دو صحابی شراب پی کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور قرآن مجید کی آیات کی تلاوت غلط اور چھوڑ کر کرنے لگے۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اب پینے والوں نے نماز کے اوقات میں پتیا چھوڑ دی جیسا کہ زید بن علی کا بیان ہے۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان نے نشہ کی حالت میں بدر کے مقتولین پر نوحہ خوانی شروع کر دی۔ حضور اکرم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد آخری آیت نازل ہوئی اور حرمت کا قطعی حکم ہو گیا۔

”وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوُ“ اور آپ سے آپ کے صحابہ پوچھتے ہیں کہ اپنے مال میں خرچ کتنا کیا جائے؟ سے کتنا صدقہ نکالیں، آپ کہہ دیجئے کہ ”عفو“ عفو کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین سے مختلف اقوال نقل ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آیت میں یہ لفظ ”بعضی“ فضل ہے، یعنی اہل و عیال کے اخراجات کے بعد جو بچے (وہ صدقہ کرو)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ، عطاء، سدی، ابن زید اور حسن رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”عفو“ سے مراد ہے ”ہر چیز میں سے تھوڑا سا، اتنا کہ خرچ کرنے والا اس میں کسی قسم کا بار نہ محسوس کرے“ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور طاؤس سے یہ قول نقل ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ ”اعتدال کے ساتھ صدقہ نکالو، یعنی اتنا مال خرچ کرو جو نہ اسراف اور فضول خرچی کہا جاسکے اور نہ بخل“

دبقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ کہ وہاں کی آسانشیں تکلیف بلکہ اتنا بڑے کے شانہ سے بھی خالی ہوں گی اور تکالیف اور ناگوار یوں میں آرام و راحت کا کوئی سوال نہ ہو گا۔ اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ کسی حرام و ناجائز چیز کے جزوی مصلح و منافع بیان کرنا اس کی حرمت و امتناع کے بنیادی کسی درجہ میں بھی نہیں۔ (مترجم)

یعنی اتنا نہ خرچ کرنا چاہیے کہ خود محتاج بن جائے، بلکہ اپنی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے خرچ کرنا چاہیے جس، عطاء اور مجاہدہ کے لئے۔
 سے اس کی روایت ہے۔ ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل ہے کہ ”عفو“ کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ بھی مسلمان دیں،
 تھوڑا ہو یا زیادہ آپ سے قبول کر لیجئے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ ”اپنے اموال میں سے پاکیزہ اور عمدہ مال کا صدقہ نکالو“ ربیع اور قتادہ سے اس کی روایت ہے۔ مجاہد
 سے ایک قول یہ نقل ہے کہ آیت میں ”عفو“ سے مراد فرض صدقہ (زکات) ہے۔

میری رائے میں راجح تفسیر یہ ہے کہ ”عفو“ سے مراد ”فضل“ ہے، یعنی اپنے اوپر اور اہل و عیال اور متعلقین پر خرچ
 کرنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد جو بچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن احادیث میں صدقہ اور اس کے
 مواقع کی نشاندہی کی ہے ان سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض
 کی، یا رسول اللہ میرے پاس ایک دینار ہے؟ حضور اکرم نے فرمایا کہ اپنے اوپر خرچ کرو۔ انھوں نے عرض کی کہ دوسرا
 دینار بھی ہے؟ فرمایا کہ اسے اپنی بیوی پر خرچ کرو۔ انھوں نے عرض کی کہ تیسرا بھی ہے۔ فرمایا کہ اسے اپنے بچوں پر خرچ کرو
 انھوں نے پھر عرض کی کہ چوتھا بھی ہے۔ آں حضور نے فرمایا کہ اس کے متعلق تم خود زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ جابر بن عبد اللہ
 رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر کوئی شخص محتاج ہے تو سب سے پہلے اسے اپنے
 اوپر خرچ کرنا چاہیے اگر باقی بچے تو ان پر خرچ کرنا چاہیے جو اس کے زیر پرورش ہیں اور اگر ابھی بچتا ہے تو اسے دوسروں
 پر صدقہ کرنا چاہیے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک صحابی سوئے کا ایک
 انڈا لیے ہوئے گئے جو انھوں نے کسی کان میں پایا تھا، انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ میری طرف سے صدقہ ہے،
 اللہ گواہ ہے کہ اس کے سوا آج میری ملکیت میں کچھ نہیں ہے۔ حضور اکرم نے ان سے اعراض کیا۔ وہ آپ کی داہنی
 طرف سے آگے پھرنے پہلے الفاظ دہراتے۔ آں حضور نے پھر اعراض فرمایا۔ انھوں نے تیسری مرتبہ کہا اور آں حضور
 نے پھر اعراض فرمایا۔ پھر جب انھوں نے چوتھی مرتبہ وہی الفاظ دہرائے تو آں حضور نے غصہ میں فرمایا کہ لاؤ دو۔ چنانچہ آپ
 نے اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اتنی زور سے پھینکا کہ اگر وہ انھیں لگ جاتا تو وہ زخمی ہو جاتے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا
 کہ تم لوگ اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے لے کر چلے آتے ہو، تاکہ محتاج ہو جاؤ اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ! غنا
 کو باقی رکھتے ہوئے صدقہ کرنا چاہیے۔ اس مضمون کی احادیث بکثرت ہیں، اور ان کا اس کتاب میں
 جمع کر دینا طوالت کا باعث ہوگا۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ اس مال کا ہونا چاہیے جو ضرورت سے بچ جائے
 اور یہی آیت میں ”عفو“ سے مراد ہے۔ کلام عرب میں بھی یہ لفظ مال اور ہر چیز میں زیادتی و کثرت ہی کے معنی میں
 استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے موقع پر بھی ”عفو“ کثرت، تعداد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان
 تمام شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر تفسیر آیت میں بھی ”عفو“، اسی معنی میں استعمال ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے
 بندوں کو انہیں حدود میں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے جس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد
 سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ ”بہترین صدقہ وہ ہے جو غنا کے ساتھ کیا جائے“، اس آیت کے ساتھ اسی مضمون کی دوسری
 آیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ایک موقع پر ارشاد ہے کہ ”اور وہ لوگ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچ کرتے
 ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور اس کے درمیان (ان کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے“، ایک اور موقع پر حضور اکرم کو خطاب

کیا گیا ہے ” اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی میں باندھ لے اور نہ اسے بالکل کھول ہی دے، ورنہ تو ملامت زدہ تھی دست ہو کر بیٹھ جائے گا“

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت کا حکم فرض زکات کے حکم کے بعد منسوخ ہو گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ آیت زکات کے فرض ہونے سے پہلے کی ہے۔ سدی سے بھی اس کی روایت ہے کہ زکات کے حکم کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے، کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ آیت میں ”عفو“ سے مراد فرض زکات ہے۔

میری رائے میں صحیح قول وہ ہے جو عطیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ زیر تفسیر آیت میں ”قُلِ الْعَفْوَ“ سے کوئی فرض حکم بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خرچ کا پسندیدہ طریقہ بتایا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ آیت صحابہؓ کے اس سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھی کہ کتنا مال خرچ کرنے سے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے اسی کی نشاندہی کی ہے، اس لیے نہ یہ صدقہ فرض (زکات) ہے، اور نہ کسی بھی دوسری آیت سے اس کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ اس کا حکم اس کے نزول کے بعد اب تک قائم و باقی ہے اس میں تقویٰ اور پاکیزگی کی حد مقرر کی گئی ہے کہ اپنے نقلی صدقات و عطیات میں اس سے تجاوز نہ ہونا چاہیے، اور اسی کی تربیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ ”جب تمہارے پاس مال ہو تو سب سے پہلے اپنے اوپر سے خرچ کرو، پھر اپنی اہل پر، پھر اولاد پر، اور اس کے بعد جو بچ جائے اس کے خرچ میں وہ راستہ اختیار کرو..... جو اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کا باعث ہو، اور یہی اعتدال کا راستہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ نہ اسراف و فضول خرچی ہو اور نہ بخل و کجوسی

وَكُنَّا إِلَيْكَ يَبْتِغُونَ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ اللہ اسی طرح تمہارے لیے کھول کر احکام بیان کرتا ہے، یعنی جس طرح میری نشانیاں اور دلائل تمہارے سامنے روشن ہیں، جس طرح اس سورت کی آیات میں میں نے اپنے شرائط و حدود تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیئے ہیں اور تمہیں بتا دیا ہے کہ کن باتوں میں تمہاری نجات ہے اور کون سے امور تمہارے لیے عذاب و سزا کا باعث ہیں، اسی طرح میں اپنی اس پوری کتاب میں جو میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی، تمام احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہوں، تاکہ تم میرے وعدے اور وعید اور میرے ثواب و عقاب پر خوب سوچ لو، اور دنیا کی معمولی لذت اور خواہشات نفسانی کی بہت جلد زائل ہو جانے والی مسرت کے لیے میری معصیت و نافرمانی سے اپنا دامن بچاؤ کہ یہ سب کچھ تم اپنی چند روزہ زندگی میں ہی کر سکو گے، لیکن اس کا عذاب اور اس کی سزا تمہیں بہت طویل زمانہ تک بھگتنی پڑے گی اور اتنی شدید اور ہلادینے والی کہ اس کا تم صحیح اندازہ بھی ابھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم خوب اچھی طرح سوچ لو اور میری فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کو اپنا شعار بنا لو، تاکہ اس کے بدلہ میں آخرت کی لازوال نعمتوں سے سرفراز ہو سکو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ”لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ کی تفسیر میں فرمایا ”تاکہ تم دنیا کے فنا و زوال اور آخرت کے بقا کے متعلق سوچ لو کہ رہنا تمہیں وہیں ہے، اور وہ جلد ہی آنے والی ہے“ قتادہ نے فرمایا کہ ”تاکہ تم دنیا پر اور آخرت کی فضیلت کے متعلق سوچ لو“ جو تفسیر ہم نے کی اسی کے مطابق ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

یتیموں کے متعلق

”وَسئَلُواكَ عَنِ الْيَتَامَى طَقْلًا صَدَاحًا لَهُمْ خَيْرٌ طَوْرَانِ نَحْنُ لَطُوهُمْ فَإِذَا خَوَا شَكْرًا“

اور آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ شرکت رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ”بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے“ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، مگر اس طریق پر کہ جو مستحسن ہو، تو مسلمانوں نے یتیموں کے اموال سے بالکل کٹنا رہ کشتی اختیار کر لی اور ان کا خرچ اپنے خرچ سے اور ان کا کھانا اپنے کھانے سے الگ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یتیموں کا خرچ تنہا ہونے کی وجہ سے زیادہ ہونے لگا اور اس کا بار قدرتی طور پر ان کے مال پر پڑا۔ اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے یتیموں کو خرچ میں شریک کر لیا اور کھانا اپنا ایک ساتھ ہونے لگا۔

اس آیت کا یہی شان نزول سعید، عبدالرحمن بن ابی ملی، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے شان نزول کے سلسلے میں یہ روایت بھی ہے کہ جب یتیموں کا مال ظلماً لے لینے پر وعید نازل ہوئی تو مسلمانوں نے جن کی پرورش میں کوئی یتیم بچہ تھا، ازراہ احتیاط کھانا پینا اور برتن تک الگ کر لیا۔ چونکہ یہ صورت حال لوگوں کے لیے دشواری کا باعث تھی اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوال پر اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیت نازل کی اور ارشاد ہوا کہ اس درجہ احتیاط مطلوب نہیں ہے، بلکہ یتیموں کی مصلحتوں کی رعایت رکھنا چاہیے، یتیموں کو اپنے ساتھ اخراجات میں شریک رکھنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ بدیتی کا مظاہرہ نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کس کا مقصد اصلاح ہے۔ اس مضمون کی روایت شعبی، عطار بن ابی رباح اور مجاہد رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یتیم کے مال سے غایت درجہ احتیاط اور اسے الگ تھلگ رکھنا عربی اخلاق کا ایک ضروری جز تھا، اس میں چونکہ دشواری تھی، اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا اور اسی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، سدی اور ضحاک سے اس کی روایت ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”اے محمد! آپ سے آپ کے صحابہ یتیموں کے مال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہ ان کے مال کے ساتھ مشترک خرچ میں، کھانے پینے، سکونت اور ملازم وغیرہ رکھنے میں اپنا مال ملا سکتے ہیں یا نہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارے لیے دنیاوی اور آخروی دونوں حیثیتوں سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ان کے اموال میں اصلاح کا خیال رکھو، اور اس کا کوئی بدلہ ان کے مال سے نہ لو، اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے اجر و ثواب کا باعث ہوگا، اور اس دنیا میں ان کے مال کی حفاظت و اصلاح کے لیے بھی بہتر ہوگا۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ خرچ میں شریک کر لو اور کھانے پینے اور سکونت میں حسب حصہ مشترک طور پر خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی بھائی ہیں، اور بھائی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہی ہیں۔ ایک بھائی اگر صاحب مال ہے تو وہ اپنے محتاج بھائی کی مدد کرتا ہے، اگر قوی ہے تو وہ اپنے کمزور بھائی کی مدد کرتا ہے، مسلمانو! تمہارا معاملہ تمہارے زیر پرورش یتیموں کے ساتھ بھائیوں ہی جیسا ہے، تمہیں ایک شفیق اور بخیر خواہ بھائی کی طرح ان کے مال و جہاد کے مصالح کی رعایت ہر موقع پر ملحوظ رکھنی چاہیے، اگر مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ تمہارے اور ان کے اخراجات مشترک ہوں تو اسی کو اختیار کرنا چاہیے اور یہ صورت تمہارے لیے قطعاً جائز ہوگی، بھائیوں میں باہم معاشرت کا کیا سوال! عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن زید اور ابراہیم رحمہم اللہ سے مختصر یہی مفہوم نقل ہے۔“

”وَاللّٰهُ يَعْصَمُ الْمَفْسِدَ مِنَ الْمَصْلِحِ“ یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ نے جو تم سب کا پالنے والا ہے، خرچ میں اپنے مال کے ساتھ ان کے مال کو شامل کر لینے کی اجازت تمہیں دی ہے، لیکن اگر تمہاری نیت اس اشتراک کے معاملہ میں صحیح نہیں ہے، تم اس طرح ان کا مال ناجائز طریقہ سے اپنے استعمال میں لانا چاہتے ہو اور مشترکہ خرچ کے ذریعہ ان کے مال و جائداد میں فساد کرنا چاہتے ہو تو اللہ سے ڈرو، کہ اس کی وجہ سے تم اللہ کی سخت سزا کے مستحق ہو جاؤ گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ خوب جانتا ہے کہ ایک یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر خرچ کرنے میں کس کی نیت میں فساد ہے اور کون اس کے مال میں اصلاح کا ارادہ رکھتا ہے۔ ابن زید اور شعبی سے یہ تفسیر منقول ہے۔

”وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَعْتَبَتْكُمْ“ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت اور پریشانی میں ڈال دیتا، اور یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر خرچ کرنے کی جو تمہیں سہولت دی ہے، اس کی تمہیں اجازت نہ دیتا۔ اور اب ازراہ رحمت و شفقت جو تمہیں رخصت دی ہے، اگر یہ رخصت نہ دیتا تو تم اللہ کے حق اور اس کے فرض کو کما حقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہوتے۔ ”لَأَعْتَبَتْكُمْ“ کی تفسیر میں مجاہد سے یہ روایت ہے کہ ”تمہیں مولشی چرانے اور سالن کی سہولت سے محروم رکھتا، مجاہد رحمۃ اللہ کی مراد یہ ہے کہ یتیم کے سرپرست اور یتیم کے مولشیوں کو ایک ساتھ چرانے کی اجازت نہ ہوتی اور نہ یتیم کے سالن میں سے کھانا تمہارے لیے جائز ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس میں تنگی ہو جاتی اور یتیموں کے سرپرست، پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ ”فَإِنْ تَخَالَطَوْهُمْ فَإِنْ تَكُونُوا“ سے بھی وہ ولی اور یتیم کے مولشیوں کو ایک ساتھ چرانا اور سالن کی شرکت مراد لیتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ ”اگر اللہ چاہتا تو تمہیں تنگی اور دشواری میں ڈال دیتا، لیکن اس نے، اس کے بجائے، تمہیں سہولت دی تمہارے لیے وسعت پیدا کی، اور یہ حکم نازل فرمایا کہ ”جو یتیم کا سرپرست (صاحب مال ہے وہ یتیم کے مال کو اپنے استعمال میں لانے سے) بچا رہے، اور اگر محتاج ہے تو وہ حسب دستور یتیم کے مال میں سے کھا سکتا ہے“ ہم نے جو تفسیر بیان کی ہے، وہی تنادہ، ربیع اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی منقول ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں جتنے اقوال اور نقل ہوئے ہیں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں لیکن مفہوم اور حاصل سب کا ایک ہی ہے۔ ”وَعَنْتَ فُلَانٌ“ مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ“ (اے حضور کے لیے تکلیف دہ وہ چیز جو تمہارے لیے باعث مشقت ہو)۔ ”ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَدَتَ“ (یہ اس کے لیے ہے جو مشقت سے ڈرتا ہو) ”عَنْتَ“ جب مزید میں ”أَعْنَتَ“ ہو جاتا ہے تو اس کے معنی ”مشقت میں ڈالنا“ ہو جاتے ہیں ”أَعْنَتَ فُلَانٌ“ فلاں نے مشقت میں ڈال دیا، یعنی ایسا حکم دیا جس کی انجام دہی باعث مشقت تھی۔

”أَعْنَتَكَ“ کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”تمہیں ہلاک کر دیتا، یعنی اس سے پہلے یتیموں کے اموال میں تم نے جو بے عنوانیاں کی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کی سزا میں تمہیں ہلاک کر دیتا۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

”إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ“ بلاشبہ اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے، یعنی اپنی سلطنت اور غلبہ میں زبردست ہے اگر وہ کسی کو سزا دینا چاہے تو کوئی مانع نہیں بن سکتا، اور وہ حکمت والا ہے، وہ تمام امور کے انجام سے واقف ہے اس لیے ہر حکم جو وہ اپنے بندوں پر نازل کرتا ہے اور اس کی ہر تدبیر پر از حکمت ہوتی ہے۔ اس کی تدبیر میں کہیں سے کوئی خامی نہیں ہوتی اس کے برعکاف بندے چونکہ انجام سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ جو بھی تدبیر اختیار کریں گے وہ اس درجہ کی کامل اور صاف ستھری نہیں ہو سکتی۔

وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ ۖ وَلَا مِمَّا مُؤْمِنَةٌ

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی کیوں نہ ہو

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ۚ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ

وہ (ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے گو وہ تم کو اچھی ہی معلوم ہو اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت

حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۖ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ۚ وَلَا

جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاویں اور مسلمان مرد غلام بہتر ہے کافر مرد سے گو وہ تم کو

أَعْبَابٌ ۚ وَلَا يَدْعُونَ إِلَى الْفِتْنِ ۚ وَاللَّهُ يَدْعُو

اچھا ہی معلوم ہو (کیونکہ) یہ لوگ دوزخ میں جانے کی تحریک دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۚ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ

اور مغفرت کی تحریک دیتے ہیں اپنے حکم سے اور اللہ تعالیٰ اس واسطے آدمیوں کو اپنے احکام بتلا دیتا ہے

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں

مشرکوں سے نکاح کی ممانعت

یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر مشرک عورت سے ہر مسلمان مرد کے نکاح کی حرمت ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کے شرک میں مبتلا ہو۔ اس عموم میں بت پرست، یہودی، نصرانی اور مجوسی سب آجاتے ہیں، کیونکہ خالص توحید کسی کے یہاں نہیں۔ اس کے بعد اہل کتاب کے ساتھ نکاح کی حرمت کو دوسری آیت سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیز دکھانے کی، ہم پر حلال کی گئی ہے، آپ کہہ دیجئے کہ تم پر کل پاکیزہ جانور حلال ہیں، اور تمہارے سدھے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار، تا اور جو لوگ اہل کتاب ہیں ان کا کھانا تمہارے لیے جائز اور تمہارا کھانا ان کے لیے جائز، اور اسی طرح تمہارے لیے جائز ہیں مسلمان پارسا عورتیں اور ان کی پارسا عورتیں جن کو تم سے قبل کتاب مل چکی ہے، نے منسوخ کر دیا۔ اب حکم یہ ہے کہ ان میں سے اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ تو نکاح جائز ٹھہرا، لیکن دوسری مشرک عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، حسن بصری، مجاہد اور ربیع رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

دوسرا قول اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ آیت کا حکم عام نہیں ہے، بلکہ صرف مشرکین، عرب یا ان کے جیسے بت پرست مجوس اور غیر اہل کتاب مراد ہیں، اس لیے اس آیت کا کوئی حکم کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے۔ آیت کے الفاظ میں اگرچہ عموم ہے، لیکن مراد خاص ہے۔ یہ قول قتادہ اور سعید بن ابی جبیر سے منقول ہے۔

شہر بن حوشب کے واسطے سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آیت کی ایک تفسیر یہ بھی نقل ہے کہ آیت کا حکم عام ہے، اور یہ کسی دوسری آیت سے منسوخ بھی نہیں ہے، یعنی ایک مسلمان صرف مسلمان عورت سے ہی نکاح کر سکتا ہے، کسی غیر مسلم عورت سے، خواہ وہ بت پرست ہو، مجوسی ہو یا کتابی ہو، اس کے لیے نکاح کرنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”اور جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا اس کا عمل اکارت ہو گیا“ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا تھا اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانیہ سے نکاح کر لیا تھا تو عمر رضی اللہ عنہ ان پر اتنے شدید ناراض ہوئے کہ شاید کوئی اقدام کر بیٹھتے، لیکن ان حضرات نے کہا کہ امیر المؤمنین، آپ ناراض نہ ہوں، ہم طلاق دے دیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ طلاق تو اس وقت ہوتی جب نکاح بھی صحیح ہوتا، انھیں جدا کر دو۔

راج تفسیر قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، یعنی آیت کے الفاظ میں اگرچہ عموم ہے، لیکن مراد مشرکین ہیں، اہل کتاب اس سے مراد نہیں ہیں۔ اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے اور کسی بھی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا۔ قرآن مجید ہی میں پاکدامن اہل کتاب عورتوں سے اسی طرح نکاح کی اجازت ہے جس طرح پاکدامن مومنات سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اگر یہ آیت زیر تفسیر آیت کے کسی حکم کے لیے ناسخ ہے تو اس کی دلیل ہونی چاہیے، جو نہیں ہے۔ شہر بن حوشب نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو رائے نقل کی ہے، وہ بے معنی ہے، کیونکہ تمام امت اہل کتاب عورت سے مسلمان کے نکاح کو جائز قراریتی ہے، اور یہ مسئلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہے۔ شہر بن حوشب کی روایت کے بالکل برعکس، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے، اس سے صحیح روایت کے ساتھ، اہل کتاب عورتوں سے نکاح کا جواز نقل ہے۔ یزید بن وہب بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مسلمان نصرانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے، لیکن مسلمان عورت کو نصرانی مرد سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے طلحہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما کے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کو ناپسند فرمایا تھا، لیکن اس کی وجہ محض پیش بندی تھی، آپ نے تنبیہ اس خطرہ کے پیش نظر کی تھی کہ مسلمانوں میں اس طرح کی شایوں کا رجحان عام پیدا ہو سکتا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اگر ابتداء ہی میں اس رجحان کو نہ روکا جاتا تو مسلمان عورتوں کے رشتوں میں مشکلات پیش آتیں۔ شفیق بیان کرتے ہیں کہ جب حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں لکھا کہ اسے جدا کر دو۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان سے لکھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے علیحدگی کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہ نکاح حرام ہے؟ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اسے حرام نہیں سمجھتا، لیکن مجھے خوف ہے کہ اس رجحان کے نتیجے میں مسلمان عورتوں کے لیے مشکلات پیش آجائیں گی۔ جبکہ ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم اہل کتاب عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں، لیکن اہل کتاب مرد ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔ اس حدیث کی سند اگرچہ کمزور ہے، لیکن شہر بن حوشب کی روایت کے مقابلہ میں اس قول کو ہم اس لیے بھی ترجیح دیں گے کہ اس پر امت کا اجماع ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے مومنو! اہل کتاب کے سوا، مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور اللہ، اس کے رسول اور شریعت کی تصدیق کریں۔

”وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالرَّسُولِ وَآيَاتِهِ“ اور یقیناً اللہ، اس کے رسول اور اس کی شریعت پر ایمان لانیوالی کثیر اللہ کے یہاں، اس آزاد عورت سے بہتر ہے جو مشرک و کفر میں مبتلا ہے، خواہ اسے حسب و نسب میں شرافت و عزت ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ ایک دوسرے موقع پر اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا ہے کہ باعزت اور شریف گھرانوں کی مشرک عورتوں سے نکاح کی خواہش بھی دل میں نہ رکھو، کیونکہ نکاح کے لیے مسلمان کنیزیں اللہ کے یہاں اتنے

بہتر ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ایک مسلمان نے ایک کنیز سے نکاح کر لیا تھا، انھیں اس پر ملامت کی گئی اور کسی مشرک عورت سے نکاح کی ترغیب دی گئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ سدی بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، ان کے پاس ایک جشن کنیز تھی۔ ایک دن وہ اس پر غصہ ہوئے اور طمانچہ مار دیا۔ بعد میں اپنے اس فعل پر بہت گھبرائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔ حضور اکرم نے دریافت فرمایا کہ وہ کیسی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ یہ رسول اللہ کے روزے رکھتی ہے، نماز پڑھتی ہے، وضو اچھی طرح کرتی ہے اور گواہی دیتی ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور اکرم نے فرمایا کہ پھر تو وہ مومنہ ہے! عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لوں گا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کے اس اقدام پر بعض مسلمانوں نے انھیں ملامت کی اور کہا کہ تم نے ایک کنیز سے شادی کر لی!۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی مشرکین کے کسی معزز گھرانے میں شادی کرادیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آنے والی کنیز کسی معزز اور شریف گھرانے کی مشرک عورت سے بھی بہتر ہے۔ ابن جریر سے بھی آیت کا یہی مفہوم نقل ہے۔ "وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ" یعنی اگرچہ مشرک عورت اپنے حسن و جمال، مال و دولت اور حسب و نسب کی وجہ سے تمہیں پسند ہی کیوں نہ ہو۔ بہر حال تم ان سے نکاح نہ کرو، کیونکہ اللہ کے نزدیک مومنہ کنیز ان سے بہتر ہے۔

«وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدًا مُّؤْمِنًا خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ» یعنی مومن عورتوں پر حرام ہے کہ وہ کسی مشرک مرد سے نکاح کریں، خواہ وہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہو۔ پس اے مسلمانو، تم اپنی عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں نہ دو، کیونکہ یہ تم پر حرام ہے بلکہ ایک مومن غلام جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کرتا ہو، بہتر ہے کہ تمہاری عورتیں اس کے نکاح میں ہوں۔ بقا بلکہ کسی مشرک کے، خواہ وہ صاحب حسب و نسب ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ تمہیں اس کا حسب و نسب پسند ہی کیوں نہ ہو۔ ابو جعفر محمد بن علی کہتے تھے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا نکاح اس کے ولی کے ذریعہ ہوگا۔ "وَلَا تُنكِحُوا" تا کے رفع کے ساتھ، قیادہ اور زہری سے آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ "تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم کسی یہودی، نصرانی، مشرک یا کسی بھی ایسے شخص سے نکاح کرو جو تمہارے دین (اسلام) پر نہیں ہے" عورتوں کے لیے، ابن جریر نے فرمایا یعنی جب تک کوئی مشرک ایمان نہ لے آئے، محض اس کی عزت و شرف کی وجہ سے اس سے نکاح نہ کرو۔ عکرمہ اور حسن بصری رحمہما اللہ سے بھی ایسی تفسیر نقل ہے۔

«أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ» یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلا رہے ہیں، یعنی اس عمل کی طرف جو جہنم کی آگ میں تمہیں داخل کر دے اللہ اور اس کے رسول کا کفر جو وہ خود کرتے ہیں اس کی طرف تمہیں بھی بلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کی نصیحت پر عمل نہ کرو، ان کی بات نہ مانو اور ان سے نکاح نہ کرو، کیونکہ یہ تمہارے لیے بڑے گھائے کا سودا ہوگا، بلکہ اس کے بجائے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، وہ تمہیں جس کام کا حکم دیتا ہے اسے بجالاؤ، جس سے روکتا ہے اس سے رک جاؤ، کہ "وہ تمہیں جنت و مغفرت کی طرف بلا رہے ہیں، یعنی تمہیں اس عمل کی دعوت دیتا ہے جو تمہارے جنت میں داخلہ کا باعث

ہو اور جس کی وجہ سے اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے۔ ”یا ذینہ“ یعنی اللہ تمہیں اس کی طرف وہ راستہ دکھا کر اور اس کی نشان دہی کر کے، بلاتا ہے جو تمہیں جنت میں پہنچا دے اور تمہاری مغفرت کا باعث ہو۔ ”اور اللہ اپنی نشانیوں کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، یعنی اپنی کتاب میں اپنے رسول کی زبانی اپنے بندوں کے لیے دلائل اور نشانیاں صاف صاف بیان کرتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں، ان دور ستوں میں تمیز کریں جن میں ایک آگ کی طرف لیجانے والا ہے اور دوسرا جنت اور اللہ کی مغفرت کی طرف! اور پھر وہ راستہ اختیار کریں جو ان کے لیے بہتر ہو۔“

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ آذَىٰ فَاَعْتَرِلُوا النِّسَاءَ فِي

اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ وہ گندی چیز ہے تو حیض میں تم عورتوں سے علیحدہ

الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ

رہا کرو اور ان سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جاویں پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جاویں تو ان کے

مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ

پاس جاؤ جس جگہ سے تم کو اللہ نے اجازت دی ہے یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِينَ ①

صاف پاک رہنے والوں سے۔

حیض کے متعلق سوال کا جواب ”وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ“ اے محمد، آپ کے صحابہ آپ سے حیض کے

بارے میں سوال کرتے ہیں، ”جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حیض کا حکم پوچھا تھا۔ اس کے بارے میں اللہ کے حکم سے پہلے حائضہ عورتوں کے ساتھ مرد ایک گھر میں نہیں رہتے تھے اور نہ ان کے ساتھ کھانا پینا کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا ہے کہ جب کسی کی بیوی کو حیض آ رہا ہو تو اللہ کا حکم یہ ہے کہ صرف ان سے جماع و ہم بستری سے پرہیز کیا جائے، اس کے سوا، کھانے پینے اور ان کے ساتھ اسٹھنے بیٹھنے سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ قتادہ اور ربیع سے اس کی روایت ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ حائضہ عورتوں کے ساتھ فطری ہم بستری تو نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے بجائے پیچھے کی طرف سے ہم بستری کرتے تھے۔ آیت میں اس کی ممانعت کی گئی اور حکم ہو کہ اس ارادہ سے عورتوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے ساتھ ہم بستری کرو، لیکن غیر فطری، پیچھے کی طرف سے ہم بستری ہر حال میں حرام ہے۔ مجاہد سے اس کی روایت ہے۔ سدی سے روایت ہے کہ سوال کرنے والے ثابت بن صالح انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔

”قُلْ هُوَ آذَىٰ“ آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندی ہے، ”آذَىٰ“ کے معنی ہیں ”وہ چیز جو باعث ناگواری و تکلیف ہو“ آیت میں مراد گندی، بدبو اور نجاست ہے۔ اس مفہوم میں ”آذَىٰ“ کے معنی کی بہت سی خصوصیات آگئی ہیں۔

مفسرین نے آیت میں اس لفظ کے مختلف معنی مراد لیے ہیں۔ سڈی اور قتاوہ سے ”گندگی“ نقل ہے، مجاہد نے فرمایا کہ اس کے معنی ”خون“ ہیں، یعنی آپ کہہ دیجئے کہ یہ خون ہے۔

”وفا عتزو النساء فی المَحِيضِ“ پس حیض کے زمانہ میں عورتوں سے جماع و ہم بستری سے بچے رہو۔ یہی مفہوم ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حائضہ عورت کے تمام بدن سے مرد اپنے آپ کو جدار رکھے اور بدن کے کسی حصہ کے ساتھ بھی مباشرت و مساس نہ کرے۔ محمد بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے پوچھا کہ اگر میری بیوی حائضہ ہو تو مجھے اس کا کیا جائز ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ لحاف ایک رکھ سکتے ہو، لیکن بستر الگ الگ ہونے چاہئیں۔ آل عباس کے مولانا ندبہ بیان کرتے ہیں کہ میمونہ بنت حارث اور حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی کے پاس بھیجا۔ ان کی آپس میں عورتوں کی طرف سے قرابت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بستر ان کی بیوی کے بستر سے الگ ہے۔ میں نے سمجھا کہ باہمی رختش کی وجہ سے ایسا ہوگا، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بستر الگ الگ کیوں ہیں؟۔ انہوں نے فرمایا کہ میں حائضہ ہوں، اور جب مجھے حیض آتا ہے تو میں بستر الگ کرتی ہوں۔ میں نے واپس آکر میمونہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما سے یہ بات کہی تو انہوں نے مجھے دوبارہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ آپ کو آخر کیا ہو گیا ہے! کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کرتے ہیں؟۔ خدا گواہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج میں سے کسی بھی زوجہ مطہرہ کے ساتھ اس وقت بھی سوتے تھے جبکہ وہ حائضہ ہوتیں، اور حضور اکرم اور ان کے درمیان صرف اتنا بڑا کپڑا حائل ہوتا جو گھٹنے سے لمبا نہیں ہوتا تھا جن حضرات کی یہ رائے ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حالت حیض میں جدار رکھنے کا حکم دیا ہے اور کوئی تخصیص نہیں کی کہ بدن کا کون حصہ جدار رکھا جائے اور کون جدار نہ رکھا جائے، اس لیے آیت کے عموم پر عمل کیا جائے گا اور مرد کو چاہیے کہ حالت حیض میں عورت کے بدن کے تمام حصوں کو اپنے سے جدار رکھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف ”گندگی کی جگہ“ کو دور رکھنے کا حکم دیا ہے، یعنی وہ مقام جہاں سے حالت حیض میں خون نکلتا ہے۔ مسروق بن الابدع بیان کرتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حالت حیض میں عورت کی کیا چیز مرد کے لیے جائز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہر چیز سوا جماع کے۔ مسروق ہی کی ایک روایت میں ہے کہ وہ سوار ہو کر عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ سلام ہو نبی پر اور ان کے گھر والوں پر۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خوش آمدید کہا اور اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ اندر گئے اور عرض کی کہ میں ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن شرم آتی ہے!۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں تمہاری ماں ہوں اور تم میرے بیٹے ہو اس لیے شرم کی کیا بات ہے، پھر آپ نے پوچھا کہ عورت کو جب حیض آ رہا ہو تو مرد کے لیے اس کی کیا چیز جائز ہے؟۔ فرمایا کہ شرمگاہ کے سوا اور سب کچھ جائز ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جامعہ زیریں سے اوپر سب کچھ جائز ہے، بعض میں ہے کہ جامعہ زیریں اگر بندھا ہو تو عورت کے ساتھ سونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس مضمون کی متعدد روایتیں آپ سے منقول ہیں ابن عباس اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما اور حسن، مجاہد، عامر اور عکرمہ رحمہم اللہ سے یہ قول نقل ہے۔ ان حضرات کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور حسن کا ثبوت تو اتر کے ساتھ ہے کہ حضور اکرم، حائضہ ہونے کی حالت میں

بھی، ازواجِ مطہرات کے جسم کے ساتھ اپنا جسم ملایا کرتے تھے، اگر حائضہ عورت کے تمام جسم کو جدا رکھنا ضروری ہوتا تو حضور اکرمؐ کبھی ایسا نہ کرتے۔ حضور اکرمؐ کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں بھی تمام جسم مراد نہیں، بلکہ صرف اس کا بعض حصہ ہی مراد ہے۔ اور ہم اس بعض سے صرف شرمگاہ ہی اس لیے مراد لیں گے کہ حالتِ حیض میں مرد پر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ آیت میں "ناف سے گھٹنے تک"، جدا رکھنا مراد ہے۔ حالتِ حیض میں عورت کے اس سے اوپر اور نیچے کے حصوں سے مراد اپنے بدن کا مساس کر سکتا ہے یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور شریح اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ سے منقول ہے۔ ان کی دلیل اس مضمون کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث ہیں جو صحیح ہیں۔ ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ہم (ازواجِ مطہرات) میں سے کوئی حائضہ ہوتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مباشرت کرنا اپنے جسم سے لگانا چاہتے تو ازار (تہبند) باندھنے کا حکم دیتے۔ آپ سے ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرمؐ حالتِ حیض میں ازار کے اوپر کے حصے کے ساتھ مباشرت کرتے، عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس مضمون کی روایتیں منقول ہیں۔ اس مضمون کی صحیح احادیث بکثرت ہیں، اگر سب کو جمع کیا جائے تو طوالت ہوگی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ حالتِ حیض میں حضور اکرمؐ نے جو کیا وہ جائز ہے، یعنی ازار کی جگہ کو چھو کر عورت کے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ لگانا، اور یہی موضع ازار ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے، اس لیے اس کے سوا حائضہ عورت کے جسم کے باقی حصوں کو مرد اپنے جسم سے لگا سکتا ہے۔ یہی قول میری رائے میں بھی راجح ہے، کیونکہ حضور اکرمؐ کی احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

"وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ"۔ "يَطْهَرْنَ" کی ایک قرارت تو یہی ہے "ھا" کے ضمہ اور اس کے بعد سکون کے ساتھ۔ اس قرارت کی صورت میں مفہوم یہ ہے کہ "اور عورتوں سے اس وقت تک قربت نہ کرو جب تک ان کے حیض کا خون بند نہ ہو جائے اور وہ پاک ہو جائیں" مجاہد عثمان بن الاسود اور عکرمہ رحمہما اللہ سے یہ قول منقول ہے۔ دوسری قرارت "يَطْهَرْنَ" "ھا" پر تشدید کے ساتھ ہے، اس سے مراد بمبالغہ طہارت ہوگی، یعنی "جب تک وہ حیض سے پاک ہونے کے بعد غسل نہ کر لیں ان سے قربت نہ کرو" یہی دوسری قرارت راجح ہے۔ اس لیے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد جب تک عورت پاکی نہ حاصل کر لے اسکے ساتھ قربت وہم بستری جائز نہیں۔ البتہ اس پاک ہونے میں اختلاف ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ پانی سے غسل مراد ہے اور جب تک حائضہ عورت خون بند ہونے کے بعد پورا غسل نہ کر لے اس کے ساتھ قربت جائز نہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ صرف نماز کا وضو طہارت کے لیے کافی ہے، اور بعض کے خیال میں شرمگاہ کے دھو لینے سے طہارت ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس پر اجماع ہے کہ خون بند ہونا ہی قربت کے لیے کافی نہیں، بلکہ اس کے بعد کسی نہ کسی نوع کی طہارت بھی ضروری ہے، اس لیے وہی قرارت صحیح ہوگی جس سے طہارت کے باب میں مبالغہ مفہوم ہوتا ہو، کیونکہ خون بند ہونے سے بھی ایک قسم کی طہارت حاصل ہو جاتی، اور ان ایام کو جن میں عورت کا خون بند رہتا ہے "طہر" کہتے ہیں پہلی قرارت سے صرف عمومی طہارت سمجھ میں آتی ہے، اور اس صورت میں اشتباہ ہو سکتا ہے کہ "يَطْهَرْنَ" سے مراد صرف خون بند ہونا ہے یا اس سے بھی آگے کچھ اور مطلوب ہے۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ "آپ سے آپ کے صحابہ حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، اس لیے تم ایامِ حیض

میں اپنی بیویوں کو جدار کھوا اور ان سے قربت نہ کرو، یہاں تک کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد وہ غسل کر لیں، ان سے قربت کر سکتے ہو۔

”فَاِذَا انْقَطَعْتُمْ مِنْهَا“ یعنی ”پھر جب“، غسل کر کے، پانی کے ذریعہ ”پاک ہو جائیں“، تو ان سے قربت کر جو ممنوع تھی وہ اب مباح و جائز ہے۔ اس کی نظر خود قرآن مجید میں متعدد ہیں، مثلاً ”جب احرام سے حلال ہو شکار کھلیو“ یا ”جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ“، ان آیات میں گو امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے فرضیت و وجوب نہیں، بلکہ صرف اباحت مقصود ہے۔

عکرمہ، سفیان، عثمان بن الاسود، حسن اور ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ قول منقول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ”جب وہ نماز کے لیے پاک ہو جائیں“ طاؤس و مجاہد سے اس کی

تفسیر پہلی ہے، یعنی آیت میں ”طہارت“ سے مراد غسل لیا جائے۔ کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ حیض کا خون بند ہونے کے بعد صرف وضو کر کے عورت نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اب اگر ”انْقَطَعْتُمْ“ سے مراد صرف نجاست سے پاکی لی جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ خون بند ہونے کے بعد اگر جسم کے ظاہری حصہ پر نجاست نہیں لگی ہے تو عورت سے ہم بستری جائز ہے، اور اس کے لیے کسی مزید طہارت کی ضرورت نہیں، ہاں اگر جسم کے ظاہری حصہ پر نجاست لگی ہوئی ہے تو اس کی صفائی ضروری ہے۔ لیکن یہ استعمال صحیح نہیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ”انْقَطَعْتُمْ“ سے مراد ”نماز کی طہارت مراد لی جائے، یعنی پانی سے پاکی حاصل کیے بغیر، اس سے ہم بستری جائز نہیں۔ اور اسی حد تک سب کا اتفاق ہے کہ اگر ظاہری نجاست نہ بھی ہو۔ پھر بھی اگر پانی کے استعمال پر عورت کو قدرت ہے تو مرد کی اس کے ساتھ ہم بستری ایسی طہارت کے بغیر جائز نہیں جس سے نماز پڑھی جاسکتی ہو۔ یہ اتفاق سب سے اہم دلیل بن گیا ہے اس کی کہ زیر تفسیر آیت میں ”طہارت“ سے مراد غسل ہی ہے، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حیض کا خون بند ہونے کے بعد عورت کے لیے غسل کے بغیر نماز پڑھنا جائز نہیں۔

پاک ہو جائیں تو تم ان کے پاس اس طریقے سے آؤ۔۔۔ جس طرح آنے کی حالت حیض میں تھیں ممانعت کی گئی تھی مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی آگے کی شرمگاہ کی طرف سے آؤ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا تھا کہ حالت حیض میں ان کے ساتھ ہم بستری نہ کرو، ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، مجاہد، عثمان بن اسود، قتادہ، ربیع اور ابراہیم رحمہم اللہ سے یہ تفسیر نقل ہے۔

اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ پھر تم ان کے پاس اس طرح آؤ جس طرح آنے کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، ظاہر ہے کہ حیض کے سوا باقی ایام میں اللہ تعالیٰ نے عورت کے ساتھ ہم بستری کی اجازت دے رکھی ہے، اس لیے مطلب ہوگا کہ حیض کے دنوں میں تو عورت کی قربت سے بچے رہو، لیکن اس کے بعد ظہر کے دنوں میں عورتوں کے پاس آؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابورزین، عکرمہ، قتادہ، شدی اور عفاک رحمہم اللہ سے اسی طرح تفسیر منقول ہے۔

و در هر یک از این کتابها
 در باب اول کتاب در حکم و در کتاب در صورت و در کتاب در

کتاب در حکم و در کتاب در صورت و در کتاب در

تالیف

امام ابو جعفر و کتاب در حکم و در کتاب در صورت و در کتاب در

کتاب در حکم و در کتاب در صورت و در کتاب در

کتاب در حکم و در کتاب در صورت و در کتاب در

کتاب

کتاب در حکم و در کتاب در صورت و در کتاب در

سینا بازار
 اچری ۵